# زمین کی تہہ میں

جولیس ورن کے ناول کا ترجمہ

شکیل صدیقی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

# زمین کی تہہ میں

جولیئس ورن کے ناول کا ترجمہ

شکیل صدیقی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

© مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

**Zameen Ki Tah Main**
Transleted by
Shakeel Siddiqi
Rs.70/-

## صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

**Email: monthlykitabnuma@gmail.com**

## شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2013 تعداد: 1100 قیمت: -/70 روپے

ISBN:978-93-5160-016-9 سلسلۂ مطبوعات:1790

---

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون نمبر:49539000 فیکس: 49539099

ای میل:urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: بھارت گرافکس۔C-83 اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیس I، نئی دہلی۔110020

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

# چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرِ نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنونِ احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہورہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ پُراسرار تحریر | ۵ | ۱۲۔ میری گمشدگی | ۷۲ |
| ۲۔ میں نے حل تلاش کرلیا | ۱۲ | ۱۳۔ زمین دوز سمندر | ۸۴ |
| ۳۔ تیاری | ۱۹ | ۱۴۔ بحری سفر کی ابتدا | ۹۰ |
| ۴۔ سفر کی ابتدا | ۲۳ | ۱۵۔ طوفان | ۱۰۲ |
| ۵۔ ہمارا گائڈ ہانس | ۳۰ | ۱۶۔ آتشی گیند | ۱۰۴ |
| ۶۔ سینی فلز پر چڑھائی | ۳۷ | ۱۷۔ بچ نکلے | ۱۰۵ |
| ۷۔ سرنگ سے نیچے | ۴۴ | ۱۸۔ حیرت ناک دریافت | ۱۱۰ |
| ۸۔ دس ہزار فیٹ نیچے | ۴۷ | ۱۹۔ غار کی تہ میں | ۱۲۱ |
| ۹۔ پانی کی تلاش | ۵۴ | ۲۰۔ آتش فشاں کا پھٹنا | ۱۲۷ |
| ۱۰۔ پانی مل گیا | ۶۲ | ۲۱۔ گھر کو واپسی | ۱۳۴ |
| ۱۱۔ سمندر کے نیچے | ۶۶ | | |

# پیش لفظ

جب آدمی کسی سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اس کو اپنی منزل معلوم ہوتی ہے یعنی یہ کہ اس کو کہاں جانا ہے۔ اسی اعتبار سے وہ سفر کی تیاری کرتا ہے۔ راستے اور سواری کا انتخاب کرتا ہے۔ سامانِ سفر ساتھ لیتا ہے۔ منزل معلوم ہو تو اس تک پہنچنے کے لیے سب سے آسان' آرام دہ اور مختصر راستہ چنا جا سکتا ہے' لیکن اگر منزل ہی نامعلوم ہو تو آدمی کبھی ایک راستے پر چلتا ہے تو کبھی دوسرے راستے پر' اور راستوں ہی میں بھٹکتا رہتا ہے۔ یہی مثال دوسرے کاموں کی ہے۔ کوئی کام شروع کرو تو پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ طے کرلو کہ اس کام کے کرنے سے تمھارا مقصد کیا ہے۔ تمھارے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہونی چاہیے کہ یہ کام تم کیوں کر رہے ہو؟ اس میں کیا فائدہ ہے اور اس کام کے پورا ہونے کے بعد تمھیں کیا حاصل ہو گا۔

حکیم محمد سعید

# پُراسرار تحریر

۲۴/ مئی ۱۹۶۳ء کو اتوار کے دن پروفیسر لائڈن بروک اپنے مکان کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ ان کا مکان ہمبرگ کے پرانے علاقے میں کنکس اسٹریٹ پر واقع تھا۔

مارتھا نے ابھی دوپہر کا کھانا تیار کرنا شروع ہی کیا تھا۔

"اگر چچا جان بھوکے ہوں گے اور انھیں کھانا نہیں ملے گا تو وہ بہت غصّے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ بہت بے صبرے انسان ہیں۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"کیا پروفیسر بروک ابھی سے آگئے؟" مارتھا نے ڈائننگ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"ہاں مارتھا' مگر لنچ تیار نہیں ہے تو پریشان نہ ہو۔ اس لیے کہ گھڑی نے ابھی ڈیڑھ بجائے ہیں۔"

"پھر پروفیسر ابھی سے کیوں آگئے؟ لو وہ تو دروازے پر پہنچ گئے۔ البرٹ میں جا رہی ہوں۔ تم ہی ان کے سامنے وضاحت کرنا۔" وہ بولی۔

پھر وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور میں تنہا رہ گیا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو غصیلے پروفیسر کا سامنا کر کے اسے پُرسکون کر سکیں۔ میں اپنے اوپری کمرے میں جانے کے لیے زینے کی طرف لپکا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور صاحبِ خانہ اندر داخل

ہوئے۔ ان کی آمد سے زینہ ہل کر رہ گیا۔ ڈائننگ ہال سے اسٹڈی کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے اپنی چھڑی ایک گوشے میں پھینکی اور ہیٹ کو میز پر اچھال دیا۔ پھر مجھ سے کہا:

"البرٹ میرے پیچھے آؤ۔"

اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا پروفیسر نے کہا "تم ابھی تک نہیں آئے۔"

میں دوڑ کر اپنے مالک کی اسٹڈی کی طرف گیا۔

پروفیسر بروک مزاج کے اعتبار سے خراب آدمی نہیں تھے، لیکن وہ روز بہ روز کچھ عجیب سے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جونائم میں علمِ معدنیات کے پروفیسر تھے اور اس مضمون پر لیکچر دیتے تھے۔ ان لیکچروں کے دوران وہ غصے میں آکر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے تھے۔ بدقسمتی سے میرے چچا بہت سے لوگوں کے درمیان اچھی طرح سے نہیں بول پاتے تھے۔ لیکچر دینے کے دوران وہ کسی مشکل لفظ پر اٹک جاتے اور جب کوشش کر کے اسے ادا کرتے تو وہ لفظ مضحکہ خیز بن جاتا۔

علمِ معدنیات میں یونانی اور لاطینی کے بہت سے ایسے الفاظ شامل ہیں کہ انھیں اچھے سے اچھا مقرر بھی خوب صورتی اور روانی سے ادا نہیں کر سکتا اس لیے پروفیسر بروک ان کی ادائیگی پر اٹکتے اور غصے ہو جاتے تھے۔

ان کی اس کمزوری سے تقریباً سب ہی واقف تھے لہٰذا طالب علم اس کے منتظر رہتے کہ وہ کب غصہ کریں تو وہ قہقہے لگائیں۔ بہت سے لوگ تو ان کے لیکچروں میں شامل ہی اس لیے ہوتے کہ قہقہے لگائیں۔

بہر حال میرے چچا ایک اچھے طالب علم تھے، وہ معدنیات اور ارضیات کے ماہر تھے۔ کسی بھی نمونے کو دیکھ کر وہ بتا سکتے تھے کہ وہ معدنیات کی چھے قسموں میں سے کون سی قسم ہے۔ اسی بنا پر پروفیسر بروک کا نام تمام اداروں اور کالجوں میں احترام سے لیا جاتا تھا۔ ہمبولٹ اور ہمفرے ڈیوی جیسے لوگ جب ہمبرگ آتے تو ان سے ضرور ملاقات کرتے

تھے۔ اس کے علاوہ علم طبیعیات کے مشہور و معروف لوگوں کو جب کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ ان سے مدد لیتے تھے۔

اور اب وہ شریف آدمی نہایت اضطراب سے مجھے بلا رہا تھا۔ وہ دراز قامت اور دبلے پتلے سے تھے، مگر ان کی صحت عمدہ تھی، اور رنگت صاف ستھری۔ اس وجہ سے وہ پچاس سال سے کم ہی کے لگتے تھے۔ ان کی کشادہ آنکھیں ہر وقت عینک کے شیشوں کے پیچھے حرکت کرتی رہتی تھیں۔ جب کہ ان کی ناک کسی چاقو کی طرح سے نوکیلی اور تیز دھار معلوم ہوتی تھی!

جب وہ چلتے تھے تو لمبے لمبے قدم اٹھاتے تھے اور ان کی مٹھیاں بھنچی رہتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ غصے میں ہوں۔ جو ان کے متعلق اتنا کچھ جانتا تھا وہ ان کے قریب پھٹکنے کی بھی کوشش نہیں کرتا تھا۔

میرے چچا کی مالی حالت اچھی تھی۔ کنگس اسٹریٹ پر ان کا جو مکان تھا اسے اینٹوں اور لکڑیوں سے تعمیر کیا گیا تھا جس کے سامنے کے رُخ پر ایک نہر تھی۔ اس مکان میں ان کے علاوہ ان کی سترہ سالہ بیٹی جولی، ملازمہ مارتھا اور میں رہا کرتے تھے۔ میں ان کا بھتیجا تھا اور ان کے کاموں میں ان کی معاونت کرتا تھا۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔

میں بچپن ہی سے چٹانوں اور معدنیات سے مانوس تھا اور مجھے یہ سب چیزیں اچھی لگتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں بڑا ہوا تو مجھے ارضیات اور معدنیات سے دل چسپی پیدا ہو گئی اور میں اپنے چچا کا ہاتھ بٹانے لگا۔

چچا جان جلد باز تھے اور جلد غصے میں آجاتے تھے، مگر اس کے باوجود میں ان کے ساتھ خوش تھا۔ وہ اس قدر جلد باز تھے کہ فطرت پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ اپریل کے مہینے میں انھوں نے اپنے کمرے میں چند گملوں میں پھولوں کے بیج ڈال دیے تو پودے نکل آئے۔ وقت گزرنے پر پودے بڑھ جاتے، لیکن چچا اتنا انتظار نہیں

کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ ہر صبح ان پودوں کی پتیاں نوچا کرتے تھے تاکہ وہ اور جلد بڑھ جائیں۔

ایسے آدمیوں کے تو اشاروں پر حرکت کرنا چاہیے اس لیے میں ان کے کمرے کی طرف لپکا۔ ان کی اسٹڈی کسی میوزیم سے کم نہیں ہے۔ وہاں تمام معدنیات کے نمونے نہایت سلیقے سے رکھے ہیں جن پر ان کے نام بھی درج ہیں۔

مجھے بھی ان نمونوں سے دلچسپی تھی اور میں انھیں جھاڑ پونچھ کر احتیاط سے رکھتا تھا۔ وہ تعداد میں اتنے تھے کہ ان کے کنکس اسٹریٹ کا یہ مکان جس میں رہا کرتے تھے دوبارہ تعمیر کیا جا سکتا تھا!

جب میں اسٹڈی میں داخل ہوا تو میں نے انھیں ایک بڑی ہتھے والی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں چرمی جلد والی ایک بھدّی سی کتاب تھی۔ "کیا خوب کتاب ہے۔" وہ کہہ رہے تھے۔ پروفیسر بروک کو غیر معمولی کتابوں سے بہت دلچسپی تھی۔ "یہ ایک بیش قیمت خزانہ ہے جو پرانی کتابوں کی دکان سے آج صبح مجھے ملا ہے۔"

"شاندار!" میں نے کہا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اس پُرانی کتاب میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"ہاں واقعی شاندار ہے۔ اچھا کیا یہ آسانی سے کھل سکتی ہے؟ ہاں آسانی سے کھل جاتی ہے۔ اچھا ذرا اس کے پشتے کی طرف دیکھو۔ سات سو سال گزرنے کے بعد بھی کہیں سے شکستہ نہیں ہوئی ہے اور اس میں کوئی درز نہیں پڑی ہے۔"

"اور اس حیرت انگیز کتاب کا نام کیا ہے؟" میں نے مصنوعی دلچسپی کا اظہار کیا۔

"یہ کتاب" چچا جان نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "بارھویں صدی کے مشہور آئس لینڈی مصنف ٹرولسن کی لکھی ہوئی ہے۔" "اس میں ناروے کے ایک شہزادے کی کہانی ہے جس نے آئس لینڈ پر حکمرانی کی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔

"کیا؟" چچا گرجے۔ "ترجمہ؟ یہ اصل کتاب ہے جو آئس لینڈ کی زبان میں لکھی ہوئی ہے۔'
مجھے اس بات پر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا "کتاب تو اچھی چھپی ہے۔"
"چھپی ہے؟ تمھارا خیال ہے کہ یہ کتاب چھپی ہوئی ہے۔ احمق لڑکے یہ مخطوط ہے' ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب' رونک خط میں۔"

"رونک؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے اس کی وضاحت چاہو گے۔ رونک حروفِ تہجی پہلے زمانے میں آئس لینڈ میں استعمال ہوتے تھے۔ لڑکے تم اسے دیکھ کر تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکو گے"

اس وقت اتفاق سے کتاب سے ایک صفحہ نکل کر فرش پر گر گیا۔ چچا نے جھک کر اسے فوراً اٹھالیا۔

"یہ کیا ہے!" وہ اضطراب سے بولے۔ وہ صفحہ تہ کیا ہوا تھا۔ انھوں نے اسے کھولا اور میز پر رکھ دیا۔ اس پر ہاتھ سے کچھ لکھا ہوا تھا جو میرے لیے نامانوس تھا۔

پروفیسر چند لمحوں تک اسے دیکھتے رہے پھر اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے بولے "یہ رونک حروف میں تحریر کیا گیا ہے اور ٹروسن کی کتاب جیسی تحریر ہے' مگر اس کا مطلب کیا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ میرا خیال ہے کہ یہ پُرانی آئس لینڈی زبان ہے۔"

ساری دنیا میں اس وقت تقریباً دو ہزار زبانیں استعمال ہو رہی ہیں' پروفیسر بروک ان سب سے تو واقف نہیں ہیں' لیکن بہر حال انھیں بہت سی زبانیں آتی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ اس تحریر کا مطلب نہیں سمجھ سکیں گے تو ان کا پارہ چڑھ جائے گا۔ میں اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا کہ اسٹڈی میں لگی ہوئی گھڑی نے دو بجائے۔

ٹھیک اسی وقت مارتھا دروازہ کھول کر اندر آئی اور اس نے کہا "سوپ تیار ہو گیا ہے۔"

"سوپ! میں سوپ نہیں پینا چاہتا۔" چچا جان چیخے۔

مارتھا پلٹ کر وہاں سے نکل گئی اور میں بھی اس کے پیچھے وہاں سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر میں کھانے کی میز پر اپنی مخصوص جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں انتظار کرتا رہا' لیکن چچا جان اپنی اسٹڈی سے باہر نہیں آئے' حالانکہ اس سے پہلے انھوں نے کبھی دوپہر کے کھانے کو منع نہیں کیا تھا۔ جب کہ کھانے میں کیا کیا نعمتیں تھیں! سوپ' انڈے' گوشت اور مچھلی۔ میرے چچا کھانے سے اس لیے انکار کر رہے تھے کہ وہ کاغذ کے ایک ٹکڑے میں الجھے ہوئے تھے۔ میں بہر حال ان کا بھتیجا تھا' اس لیے مجھ پر فرض عائد ہوتا تھا کہ اپنے علاوہ ان کا کھانا بھی کھاؤں۔ یہ سوچ کر میں جٹ گیا۔

"پروفیسر بروک کھانے نہیں آئے۔" مارتھا نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "اس کا مطلب ہے کہ کوئی خاص بات ہو گئی ہے۔"

میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس کا کوئی خاص مطلب ہے۔ ایک خاص بات ضرور ہو سکتی تھی کہ اپنے چچا کا کھانا کھانے سے میرا پیٹ خراب ہو جائے! میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ چچا کی گرج سنائی دی۔ میں وہاں سے لپک کر پھر اسٹڈی میں چلا گیا۔

"یقیناً یہ رونک حروف ہیں۔" پروفیسر نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ "اور میں اس کا مفہوم جاننا چاہتا ہوں۔ بیٹھو اور لکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

میں تیار ہو گیا۔

انھوں نے رونک حروف انگریزی میں ترجمہ کرائے اور پھر انھیں غور سے دیکھا' مگر تحریر سے کوئی مفہوم نہیں نکلا۔ پھر انھوں نے محدب عدسے' سے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس کتاب کا جائزہ لیا کہ ممکن ہے اس کتاب کے مالک نے اس پر اپنا نام لکھا ہو۔ اس کا نام دھندلا گیا تھا' لیکن چچا نے پھر بھی پڑھ لیا۔ "آرنی۔" وہ فاتحانہ انداز میں چیخے۔ "یہ سولھویں صدی میں آئس لینڈ کا مشہور سائنس داں تھا' جس نے حیرت انگیز چیزیں دریافت کی تھیں' لیکن اس نے ایسی گنجلک اور پیچیدہ تحریر کیوں لکھی ہے؟"

"اگر اس سائنس داں نے کچھ دریافت کر لیا تھا تو اسے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے۔ جب تک اس تحریر کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا میں اس وقت تک نہ تو کچھ کھاؤں پیوں گا اور نہ ہی سوؤں گا' اور البرٹ تم بھی ایسا نہیں کرو گے؟" انھوں نے کہا۔

"اوہ خدایا!" میں نے سوچا۔ شکر ہے کہ میں نے آج دوپہر کو دو کھانے کھا لیے ہیں۔"

"سب سے پہلے ہمیں بنیادی بات سمجھنا چاہیے کہ آرنی ایک تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اس نے جب اپنی زبان میں کتاب نہیں لکھی تو لازماً لاطینی کا سہارا لیا ہوگا' مگر اس لاطینی میں دوسری زبان کے الفاظ کی آمیزش بھی ہے۔ البرٹ اس تحریر میں ایک سو بتیس الفاظ ہیں آؤ ذرا انھیں دیکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے میرے سامنے پڑا ہوا کاغذ اٹھا لیا۔ لیکن میں کاغذ کی طرف دیکھنے کی بجائے دیوار پر لگی جولی کی تصویر دیکھنے لگا۔ نیلی آنکھوں والی جولی جسے میں پسند کرتا تھا اور شادی کرنے والا تھا۔

مجھے وہ دن یاد تھے جب میں اس کے ساتھ چچا کے پتھروں کو درست کیا کرتا اور انھیں ترتیب سے رکھا کرتا تھا۔ پھر ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دریا کی سیر کو جاتے تھے۔

چچا جان نے اچانک میز پر ہاتھ مارا تو میں خیالوں کی دنیا سے واپس آ گیا۔ "البرٹ۔" انھوں نے کہا "ہمیں ہر لفظ کا پہلا حرف اور پھر دوسرا لفظ لکھنا چاہیے۔"

میں نے مستعدی سے کاغذ سنبھالا اور اس پُرانی تحریر کے لفظ کا پہلا حرف لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چچا نے اس کاغذ کو دیکھا اور الجھن سے بولے "اب بھی کوئی مفہوم نہیں نکلا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" انھوں نے اپنا ہاتھ چلایا تو میز پر رکھی دوات ایک طرف جا پڑی اور میرے ہاتھ سے قلم گر گیا۔

انھوں نے اسٹڈی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے۔ پھر میں نے انھیں مکان سے

بھی باہر جاتے دیکھا۔

# میں نے حل تلاش کر لیا

جاتے وقت چونکہ انھوں نے دروازہ زور سے بند کیا تھا' چنانچہ مارتھا چونک گئی اور میرے قریب آکر پوچھنے لگی۔ "کیا وہ چلے گئے؟ آخر وہ کھانا کب کھائیں گے؟"

"وہ اس وقت کا کھانا نہیں کھائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور شام کا!"

"وہ شام کا کھانا بھی نہیں کھائیں گے مارتھا۔ جب تک وہ تحریری معمّا حل نہیں کرلیں گے جس کے حل ہونے کی کوئی امید نہیں ہے' اس گھر کا کوئی فرد اور وہ خود کھانا نہیں کھائیں گے۔"

"اوہ ڈیر! تمھارا مطلب ہے کہ ہم بھوک سے مر جائیں گے؟" اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا اور کچن کی طرف واپس چلی گئی۔

میں نے سوچا کہ میں جولی کو جاکر ساری باتیں بتاؤں' لیکن یہ سوچ کر رُک گیا کہ اگر پروفیسر اس دوران واپس آگئے اور انھوں نے مجھے طلب کرلیا اور میری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو کیا ہوگا؟ عقلمندی یہی تھی کہ میں گھر پر ہی ٹھہروں۔ میں نے فرانس سے آئے ہوئے پتھروں کے نئے ذخیرے کو ترتیب سے رکھنا شروع کردیا' لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میرے سر میں درد ہونے لگا اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا جیسے کوئی ہولناک واقعہ رونما ہونے والا ہے!

جب وہ سب پتھر میں نے ترتیب سے رکھ دیے تو اپنا پائپ سلگالیا اور سوچنے لگا کہ آخر پروفیسر کہاں گئے ہوں گے۔ وہ اس معمّے کو حل کرکے لوٹیں گے یا پھر ناکام آئیں گے؟

میں نے کاغذ کا وہ پُرزہ اٹھالیا جس پر میں چچا کی ہدایت کے مطابق حروف لکھتا رہا تھا۔

'آخر اس کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟' میں نے سوچا۔ میں دیر تک دماغ سوزی کرتا رہا' مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر میں نے اس کاغذ کو الٹ دیا اور تحریر کا عکس دوسری طرف سے دیکھنے لگا۔ اس طرح سے میری سمجھ میں لفظوں کا کچھ اور مفہوم بھی آ گیا۔

اچانک یہ محسوس ہوا جیسے مجھے اس معمّے کا حل مل گیا ہو!

میں نے اس پُرزے کو پھر پلٹ دیا اور تحریر کے ہر لفظ پر انگلی رکھ کر اس کا مفہوم اخذ کرنے لگا۔ جب میں نے اس کا مفہوم سمجھ لیا تو میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ ''اوہ نہیں!'' میں نے خود کلامی کے انداز سے کہا۔ میرے چچا کو اس بارے میں نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ اگر انھیں اس سفر کے بارے میں معلوم ہو گیا تو پھر وہ یہ سفر خود کرنا چاہیں گے۔ انھیں کوئی طاقت نہیں روک سکے گی اور وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہیں گے۔ لیکن ہم واپس نہیں آ سکیں گے۔ نہیں' کبھی نہیں۔

میں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت ذہنی طور پر کتنا پریشان تھا!

میں نے سوچا اگر میرے چچا نے اس تحریر پر غور و خوض کیا تو وہ بھی اس کا مفہوم سمجھ لیں گے۔ اس لیے مجھے چاہیے کہ میں اس پُرانی تحریر کو ضائع کر دوں۔ اسٹڈی میں آگ روشن تھی۔ میں نے کاغذ کا وہ پُرزہ اور آرنی کی وہ کتاب اٹھالی۔ پھر میں وہ دونوں چیزیں شعلوں کی نذر کرنے ہی والا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور میرے چچا اسٹڈی میں داخل ہوئے۔

میں نے سہم کر دونوں چیزیں پھر سے میز پر رکھ دیں۔

چچا جان نے میری طرف دیکھے بغیر اس تحریر پر پھر غور کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے قلم اٹھایا اور جمع تفریق کرنے لگے۔ اس میں تین گھنٹے گزر گئے مگر ان کی محویت میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ سورج غروب ہو گیا اور ہر طرف سناٹا چھا گیا' مگر چچا جان اپنے گرد و پیش سے بے خبر اس معمّے کو حل کرنے میں لگے ہوئے

تھے۔اس تحریر کو سیکڑوں طریقوں سے حل کیا جا سکتا تھا اور وہ ہر طریقہ آزما رہے تھے!

اس دوران مارتھا کھانے کو پوچھنے بھی نہیں آئی۔ میں سو گیا۔ جب دوسری صبح اٹھا تو میں نے پروفیسر کو بدستور اس معمّے میں الجھے دیکھا۔ وہ اس تحریر کا مفہوم ابھی تک نہیں سمجھ سکے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ، گال زرد اور بال الجھ چکے تھے۔

ان کی حالت دیکھ کر مجھے ترس آ گیا۔ مگر میں نے انھیں اس الجھن کا حل نہیں بتایا اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ وہ لازماً سفر کرنا چاہیں گے اور ایسا معرکہ انجام دینا چاہیں گے جو اب تک کسی ماہر ارضیات نے انجام نہیں دیا۔ انھیں اس تحریر کا مفہوم بتانا بالکل ایسا ہی تھا جیسے انھیں خودکشی کرنے کا آسان طریقہ بتا دیا جائے۔

چنانچہ میں خاموش رہا، مگر اپنے معدے کو بھول گیا۔

مارتھا صبح کو بازار نہیں جا سکی اس لیے کہ پروفیسر صدر دروازے کو لاک کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ اب ناشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنی بھوک پر قابو پائے خاموش بیٹھا رہا۔ بارہ بجے کے قریب پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے مگر میں ضبط کیے رہا۔ البتہ جب دو بج گئے تو میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ پروفیسر اس سفر کا خطرہ مول لے لیں، انھیں تحریر کا مفہوم بتا دیا۔

میں نے ان سے گزارش کی کہ وہ تمام لفظوں سے پہلا حرف لے کر انھیں الٹی ترتیب سے پڑھیں۔ پروفیسر نے اس طرح سے پڑھا تو خوشی سے چیخ پڑے۔ تحریر کا مفہوم کچھ اس طرح سے تھا:

یوکل کے سینی فلز کے دہانے میں اتر کر نیچے جاؤ
جہاں کہ اسکارٹرس کا سایہ پڑتا ہے
دلیر مسافر، یکم جولائی سے پہلے

پھر تم زمین کے مرکز تک پہنچ جاؤ گے

میں وہاں تک پہنچ چکا ہوں۔ آرنی

چچا جان خوشی سے اچھلنے لگے۔ کبھی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگے، کبھی اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتے۔ انھوں نے کئی کرسیاں ادھر اُدھر کیں، اپنے قیمتی پتھر ہوا میں اچھالے اور پھر ایک آرام کرسی میں گر گئے۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"تین بجے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"اوہ کیا واقعی؟ میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔ آؤ پہلے کھانا کھاتے ہیں اور اس کے بعد....."

"اس کے بعد؟"

"تم میرا بوریا بستر لپیٹنا"

"اور اپنا۔ اور اپنا بھی۔" انھوں نے کہا اور کمرے کی طرف چلے گئے۔

ان کے احکام سن کر میں لرز گیا۔ زمین کے مرکز تک پہنچنے کا خیال کیسی دیوانگی تھی! مگر میں نے اپنی دلیلیں اور اعتراضات کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھے اور کھانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

چچا جان نے دروازہ کھولا تو مارتھا بازار گئی اور سودا سلف خرید کر لے آئی۔ پھر اس نے ایک گھنٹے میں کھانا تیار کر دیا تو ہم نے مل کر کھایا۔ کھانے کے بعد چچا نے مجھے پھر اسٹڈی میں چلنے کو کہا۔

"البرٹ۔" انھوں نے ملائمت سے کہا۔ "تم ایک ہوشیار اور نوجوان لڑکے ہو۔ ہمیں جلد ہی ایک بڑی خوشی حاصل ہونے والی ہے جس میں تمھارا بھی حصہ ہوگا۔"

میں نے سوچا کہ اس وقت ان کا موڈ اچھا ہے لہٰذا ان سے اس خوشی کے بارے

میں پوچھنا چاہیے۔

"اس کے علاوہ تم ان باتوں کا کسی سے تذکرہ نہیں کرنا۔ سائنس کے شعبے میں میرے جو دوست ہیں وہ اس سے فائدہ اٹھالیں گے چنانچہ تم سفر سے واپسی تک اپنا منہ بند رکھنا۔" وہ بولے۔

"کیا کوئی دوسرا بھی اس سفر کو کرنا چاہے گا؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً دوسرے ماہر ارضیات آرنی کے پیچھے دوڑ پڑیں گے۔"

"چچا جان مجھے اس پر یقین نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کا ثبوت نہیں ہے کہ آرنی نے ایسا کوئی سفر کیا ہے۔ یہ مذاق بھی ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم اسے دیکھ لیں گے۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"مگر آپ مجھے اس کی اجازت دیجیے کہ میں ساری دشواریاں بیان کروں۔"

"ہاں ضرور لڑکے۔ تمھیں اس کی اجازت ہے' اس لیے کہ تم اب میرے پارٹنر ہو۔"

"سب سے پہلے تو یہ کہ سینی فلز یوکل اور اسکارٹرس کا کیا مطلب ہوا؟"

"یہ معلوم کرنا تو بہت آسان ہے۔ کتابوں کے شیلف کے چوتھے خانے سے اٹلس نکال کر لے آؤ۔"

میں نے شیلف سے اٹلس نکال کر چچا کو دیا تو انھوں نے اسے کھولا۔

"یہ آئس لینڈ کا سب سے اچھا نقشہ ہے۔ اس جزیرے پر جتنے بھی آتش فشاں ہیں ان کے ناموں کے ساتھ یوکل لگا ہوا ہے جس کا مطلب ہے گلیشیر۔ برف کی موٹی تہ کے نیچے دھماکے ہوتے رہتے ہیں اور آتش فشاں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔"

"لیکن سینی فلز؟"

مجھے ایک لمحے کے لیے مایوسی ہوئی کہ ان کے پاس اس کا بھی جواب تھا۔

"یہ آئس لینڈ کا مغربی ساحل ہے میں اس پر انگلی رکھ رہا ہوں اب اسے دیکھتے رہنا۔

ھلیہ دارالحکومت رکیاوک ہے.....اس کے آگے کیا ہے؟"

"خشکی کا ایک ٹکڑا ہے جو کسی ہڈی کی طرح نکلا ہوا ہے' مگر آخر میں پچکا ہوا سا ہے۔"

"اس پچکے ہوئے حصے کے قریب کوئی اور چیز ہے؟"

"ایک پہاڑ ہے۔"

"یہ سینی فلز ہے۔ یہ پانچ ہزار فیٹ بلند ہے اور اگر اس کا دہانہ واقعی زمین کے مرکز تک جاتا ہے تو پھر یہ ساری دنیا میں مشہور ہو جائے گا۔"

"لیکن یہ ناممکن ہے" میں نے کہا۔ مجھے زمین کے مرکز تک پہنچنے کا خیال نہایت احمقانہ لگا۔

"ناممکن؟ ناممکن کیوں؟" پروفیسر نے مسکرا کر پوچھا۔

"اس لیے کہ آتش فشاں کے دہانے سے دہکتی ہوئی چٹانیں اور پگھلتا ہوا لاوا نکل رہا ہو گا اور....."

"مگر سینی فلز ایک مردہ آتش فشاں ہے۔ آخری بار یہ ۱۲۲۹ء میں پھٹا تھا۔"

میں اس موضوع پر ان سے بحث نہ کر سکا۔

"پھر اسکارٹرس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اور اس میں یہ کیوں لکھا ہے یکم جولائی سے پہلے؟"

چچا جان چند لمحوں تک سوچنے کے بعد بولے۔ "سینی فلز کے بہت سے دہانے ہیں اور آرنی یہ بتانا چاہتا تھا کہ کس دہانے سے زمین کے مرکز تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یکم جولائی سے پہلے اس پہاڑ کی چوٹی کا سایہ ٹھیک اس دہانے پر پڑے گا۔ اس لیے جب ہم سینی فلز کی چوٹی پر پہنچیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں کس طرف جانا ہے۔"

چچا جان کے پاس چونکہ آرنی کے تحریری پیغام کے سارے سوالوں کے جواب تھے اس لیے میں نے سائنسی اعتراضات کرنا شروع کر دیے۔

"ٹھیک ہے مجھے اعتراف ہے کہ یہ تحریر واضح ہے اور اس میں کوئی ابہام نہیں ہے۔

آرنی، سینی فلز گیا ہوگا۔ اس نے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اس کا سایہ بھی کسی دہانے پر پڑتے دیکھا ہوگا، مگر وہ اس دہانے سے زمین میں نہیں اترا۔ وہاں سے زندہ سلامت واپس آگیا..... اوہ نہیں خدایا وہ نیچے جا ہی نہیں سکتا تھا۔"

"کیوں نہیں جا سکتا تھا؟" چچا نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"اس لیے کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سطح زمین سے ہر ستر فیٹ نیچے جانے کے بعد درجہ حرارت ایک درجہ بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا ہم کسی بڑے سوراخ سے زمین کے نیچے اس کے مرکز تک پہنچ جائیں تو وہاں ہمیں ہر ایک چیز گیس کی حالت میں ملے گی جس کا درجہ حرارت تقریباً بیس لاکھ درجے ہوگا۔"

"البرٹ! تم درجۂ حرارت کی وجہ سے پریشان ہو؟"

"جی ہاں، مجھے یہ بات پریشان کر رہی ہے۔"

"تم کو اندیشہ ہے کہ نیچے پہنچ کر تم پگھل جاؤ گے۔ مگر تم یا کوئی دوسرا شخص یہ نہیں جانتا کہ زمین کے اندر کیا ہے۔ ایک خاص گہرائی میں پہنچنے کے بعد درجہ حرارت بڑھنے کے بجائے کم کیوں نہیں ہو جائے گا؟"

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"اس کے علاوہ۔" انھوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "سائنس دانوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر زمین کے مرکز کا درجہ حرارت بیس لاکھ درجے ہوتا تو اب تک پیدا ہونے والی گیس پھٹ کر اس کے ٹکڑے کر دیتیں اور یہ حقیقت ہے کہ زمین کی اندرونی حرارت روزہ بہ روز کم ہو رہی ہے اس لیے کہ شروع میں دنیا میں جتنے آتش فشاں تھے، اب نہیں ہیں۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔"

"مگر ایک بڑا سائنس داں بہر حال مجھ سے متفق ہے۔ ایک انگریز کیمیاداں ہمفرے ڈیوی ۱۸۲۵ء میں مجھ سے ملاقات کرنے آیا تھا اس نے کہا تھا کہ زمین میں جو گرمی ہے وہ

اس کی سطح گرم ہونے کی وجہ سے ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ زمین کے مرکز میں کسی حدت کا وجود نہیں ہے۔ بہر حال آرنی کی طرح ہم بھی اس کا مشاہدہ کرلیں گے' لیکن اس کے بارے میں ابھی اپنی زبان نہ کھولنا' ورنہ ہم سے پہلے کوئی اور وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور ہمارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔"

# تیاری

میں چچان جان کی اسٹڈی سے نکل آیا۔ گھر میں مجھے بہت گھٹن محسوس ہو رہی تھی' اس لیے میں دریا کی طرف چلا گیا۔ کیا چچا واقعی زمین کی تہ تک سفر کرنے والے تھے اور مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے؟ یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا تو میں اس سڑک کی طرف چل پڑا' جہاں جولی سے ملاقات ہونے کا امکان تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے آتی دکھائی دی۔

"البرٹ مجھے خوشی ہے کہ تم مجھ سے ملاقات کرنے آرہے تھے۔" وہ حیرت سے بولی۔ پھر اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی تو اس نے کہا۔ "تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" "ہاں ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا۔

چند لمحوں تک وہ خاموش رہی۔ معلوم نہیں اس کے دل کی کیا کیفیت تھی۔ وہ میرے دل کی طرح دھڑک رہا تھا یا پُر سکون تھا' بہر حال یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے تھے۔

"البرٹ!" اس نے بالآخر کہا۔ "یہ سفر بے حد سنسنی خیز رہے گا۔ ایک سائنس داں کا بھتیجا ہونے کی حیثیت سے' بے حد مناسب!"

"کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو جولی؟ کیا تم مجھے یہ مشورہ نہیں دو گی کہ میں یہ سفر نہ کروں؟"

"نہیں البرٹ اگر میں لڑکی نہ ہوتی تو تم دونوں کے ساتھ اس سفر میں شریک ہوتی۔"

جولی کے اس طرح باتیں کرنے سے مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھے اس سفر پر جانے سے روکتی وہ خود جانے پر آمادہ تھی۔ بہر حال، یکم جولائی ابھی کافی دور تھی اور ممکن تھا کہ چچا اس وقت تک زمین کی تہ میں اترنے کا فیصلہ تبدیل کر دیتے۔

جب ہم کنکس اسٹریٹ والے مکان پر پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہاں خاموشی چھائی ہوئی ہو گی اور چچا جان معمول کے مطابق اپنی خواب گاہ میں ہوں گے۔ لیکن میں نے انھیں چند آدمیوں کے درمیان کھڑے ہاتھ ہلاتے اور چیختے چلاتے دیکھا۔ وہ لوگ مکان سے سامان باہر نکال رہے تھے اور مارتھا گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھر رہی تھی۔

"جلدی کرو البرٹ" چچا نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "تم نے میرے کاغذات ترتیب سے نہیں رکھے اور مجھے اپنے بیگ کی چابی بھی نہیں مل رہی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ میں کوئی بھیانک خواب نہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ چچا اس سفر پر جانے کے لیے تیار ہیں۔

"کیا ہم واقعی جا رہے ہیں؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہاں لڑکے یقیناً ہم پرسوں صبح جائیں گے۔"

میں دوڑ کر اپنے کمرے کی طرف گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ چچا جان سفر پر جا رہے ہیں اس لیے کہ انھوں نے سفر میں استعمال ہونے والی ضروری چیزوں کی خریداری کر لی تھی۔ راہداری میں رسیاں، سیڑھیاں، لالٹین اور کلھاڑیاں وغیرہ پڑی تھیں۔

اس رات میں اچھی طرح سے سو نہ سکا۔ دوسرے دن صبح ہی جولی نے مجھے جگا دیا۔

"پیارے البرٹ اٹھو۔"

میرا خیال تھا کہ میری سرخ آنکھیں اور زرد چہرہ دیکھ کر جولی کو مجھ سے ہمدردی

ہو جائے گی اور وہ اس بارے میں اپنا خیال تبدیل کر دے گی کہ مجھے بھی چچا کے ساتھ سفر پر جانا چاہیے۔

"اوہ رات بھر آرام کرنے کے بعد تمھاری حالت کافی بہتر ہو گئی ہے۔" وہ بولی۔

"بہتر ہو گئی ہے!"

"البرٹ۔" جولی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس بارے میں پروفیسر سے طویل گفتگو کی ہے۔ وہ بہت باحوصلہ آدمی ہیں اور یاد رکھو کہ ان کا خون تمھاری رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے۔ انھوں نے مجھے وضاحت سے اپنا منصوبہ بتایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انھیں اس سفر میں کامیابی حاصل ہو گی۔ اوہ البرٹ وہ دن کتنا پُر مسرت ہو گا جب پروفیسر بروک اور اس کے ساتھی اس سفر سے واپس آئیں گے۔ تم ایک تجربے کار شخص بن چکے ہو گے۔ تقریباً ان کے برابر۔ تم اپنے تجربات سے لوگوں کو آگاہ کرو گے اور تمھیں اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہو گی۔" کہتے ہوئے اس کا چہرہ مسرت سے سرخ ہو گیا جو مجھے بہت اچھا لگا۔

اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم لوگ جا رہے ہیں۔ میں جولی کے ساتھ پروفیسر کی اسٹڈی میں گیا۔ "چچا جان میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آخر آپ کو جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ آج صرف ۲۲/ مئی اور....."

"احمق کہیں کے۔ کیا یہاں سے آئس لینڈ جانا آسان ہے؟ کوپن ہیگن سے مہینے میں صرف ایک جہاز کیاوک کو جاتا ہے اور وہ بھی ۲۲/ تاریخ کو۔"

"پھر؟"

"پھر اگر ہم ۲۲/ جون تک انتظار کرتے رہے تو آتش فشاں کے دہانے پر اسکارٹرس کا سایہ پڑتا نہیں دیکھ سکیں گے۔ اس لیے ہمیں جلد از جلد کوپن ہیگن پہنچنا چاہیے تاکہ وہاں سے کوئی جہاز مل سکے۔ جاؤ اور جا کر اپنا سامان باندھو۔"

میں اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جولی نے ضروری چیزیں ایک بکس میں بند کر دیں۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے غصہ آرہا ہے لہٰذا وہ خاموش تھی۔ میرا غصہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ میں نیچے چلا گیا۔ وہاں سارے دن ضروری سامان اور بندوقیں وغیرہ آتی رہیں۔ مارتھا بے چاری اس سامان کو حفاظت سے رکھتی جا رہی تھی۔

"کیا پروفیسر دیوانے ہو گئے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"اور وہ تمھیں اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"کہاں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا تہہ خانے میں؟" پرانی خادمہ نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس سے بہت نیچے۔" میں نے کہا۔

جب رات ہو گئی تو چچا جان نے کہا۔ "اب صبح تم سے ملاقات ہو گی۔ ہم لوگ چھے بجے یہاں سے چل دیں گے۔"

میں اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر گیا۔ رات بھر مجھے ایسے خواب آتے رہے کہ جیسے میں زمین میں پڑے ہوئے بڑے بڑے شگافوں میں اتر رہا ہوں۔ چچا جان کا طاقتور ہاتھ مجھے گڑھے میں کھینچ رہا ہے اور میں مسلسل گر رہا ہوں۔

میں نے صبح پانچ بجے اٹھ کر کپڑے تبدیل کیے اور نیچے گیا۔ چچا جان میز پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ میں نے انھیں ناگواری سے دیکھا۔ جولی وہاں موجود تھی اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔ ناشتہ میرے حلق سے نہیں اتر سکا۔

ساڑھے پانچ بجے ایک گھوڑا گاڑی آ گئی جس میں سامان سمیت ہمیں ریلوے اسٹیشن

تک پہنچنا تھا۔ جب گاڑی میں سامان رکھا جا چکا تو چچا جان نے گھر کی چابیاں جولی کے حوالے کر دیں۔ پھر جولی نے چچا جان کا الوداعی بوسہ لیا۔ جب وہ مجھ سے مصافحہ کر رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"جاؤ البرٹ جاؤ۔" اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "جب تم واپس آؤ گے تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

میں اور چچا جان گاڑی میں بیٹھ گئے تو جولی اور مارتھا نے دروازے سے ہاتھ ہلا کر ہمیں الوداع کہا۔ پھر کوچوان نے سیٹی بجائی تو گھوڑے اسٹیشن کو جانے والی سڑک پر دوڑنے لگے۔

# سفر کی ابتدا

ساڑھے چھے بجے ہم اسٹیشن پر پہنچ چکے تھے اور سات بجے ٹرین کے ایک ڈبے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ہمارا سامان قریب ہی رکھا تھا۔ ٹرین نے سیٹی بجائی اور چل پڑی۔ میں کھڑکی سے وہ منظر دیکھنے لگا جو تیزی سے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ جب کہ چچا جان اپنے بیگ اور پھر جیبیں ٹٹولنے لگے کہ وہ سارے ضروری کاغذات اپنے ساتھ لے کر آئیں ہیں یا نہیں۔ میں نے ان کے ہاتھ میں کھال پر لکھی ہوئی تحریر دیکھ کر منہ بنایا اور دل کی گہرائیوں سے لعنت بھیجی۔

تین گھنٹے بعد ٹرین کائل پہنچ گئی۔ وہاں سے ہم نے بحری جہاز کے ذریعے سفر کیا اور پھر ایک ٹرین سے صبح دس بجے کوپن ہیگن پہنچ گئے۔ وہ ۲۸ر مئی کی صبح تھی۔ اسٹیشن سے ہم لوگ ایک ہوٹل چلے گئے۔ چچا جان نے جلدی سے غسل کیا پھر مجھے لے کر جیٹی پر گئے تاکہ آئس لینڈ جانے والا کوئی جہاز تلاش کر سکیں۔

مجھے توقع تھی کہ ایسا کوئی جہاز نہیں مل سکے گا، مگر اس وقت میں کافی مایوس ہوا جب الکائر

نامی ڈنمارک کا ایک چھوٹا سا جہاز رکیاوک جانے کے لیے مل گیا جو ۲/جون کو وہاں پہنچنے والا تھا۔ پروفیسر اتنے خوش تھے کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ جہاز کا کپتان ہم سے دُگنا کرایہ نہ وصول کرلے۔ ''تم لوگ منگل کو صبح سات بجے آجانا۔'' اس نے کرایہ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم خوش قسمت ہیں کہ اس جہاز میں جگہ مل گئی۔'' چچا جان نے کہا۔ ''اچھا آؤ اب ناشتہ کرلیں اور اس کے بعد کوپن ہیگن کی سیر کریں۔''

ناشتہ کرنے کے بعد میں چچا جان کے ساتھ کسی ننھے بچے کی طرح شہر کی سیر کرتا رہا۔ وہاں حیرت انگیز چیزیں تھیں جنھیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے سوچا کاش کہ جولی بھی اس وقت میرے ساتھ ہوتی، مگر وہ تو مجھ سے بہت دور بیٹھی تھی، اور یہ بھی ممکن تھا کہ اب میں اسے کبھی نہ دیکھ سکوں۔

چچا جان حالانکہ میرے ساتھ تھے، لیکن انھیں شاہی محلوں اور دوسری خوبصورت عمارتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ وہ شہر کے جنوب مغربی حصے میں ایک چرچ کے مخروطی حصے کو دیکھ کر جوش و خروش کا اظہار کرنے لگے۔

میرے نزدیک چرچ میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی، مگر پروفیسر کا کہنا تھا کہ چرچ کے مینار تک راستہ بل کھاتا ہوا چلا گیا ہے۔ ''آؤ اس سے چوٹی تک چلتے ہیں۔'' وہ بولے۔

''آپ چوٹی تک کیوں جانا چاہتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''ہمیں اونچائی تک جانا چاہیے تاکہ ہم اس کے عادی ہو جائیں۔'' وہ بولے۔ میں ہچکچایا تو انھوں نے کہا۔ آؤ میرے ساتھ تم وقت ضائع کر رہے ہو۔''

ہم نے اس مینار پر چڑھنا شروع کر دیا۔ چچا جان آگے تھے۔ اور پھرتی سے چڑھ رہے تھے۔ میں سہما ہوا ان کے پیچھے تھا۔ جب تک ہم نیچے تھے اس وقت تک کچھ نہیں ہوا، لیکن تقریباً ڈیڑھ سو قدمچے طے کرنے کے بعد تازہ ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرانا شروع ہو گئے۔ اب زینے کا وہ حصہ شروع ہو گیا تھا جو بیرونی رُخ پر تھا۔ وہاں قدمچے

چھوٹے تھے اور سہارے کے لیے صرف ایک فولادی ریلنگ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زینہ کہیں خلا میں جا کر گم ہو گیا ہو!

"میں اور اوپر نہیں چڑھ سکتا۔" میں نے کہا۔

"آؤ بزدل کہیں کے۔" پروفیسر بولے۔

مجھے بہر حال ان کے پیچھے جانا تھا۔ میں نے ریلنگ کا سہارا لے رکھا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مینار ہوا کے زور سے ہل رہا ہو! میری ٹانگیں کمزور پڑنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری ہمت جواب دے گئی اور میں گھٹنوں کے بل زینے طے کرنے لگا اور اس کے بعد تقریباً لیٹ گیا اور پیٹ کے بل رینگنے لگا۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا اس لیے میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

بالآخر میں مینار کے گنبد تک پہنچ گیا، مگر اس طرح سے کہ چچا جان میری قمیص کا کالر پکڑ کر مجھے کھینچ رہے تھے۔ "دیکھو۔" وہ بولے۔ "غور سے دیکھو۔"

میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں تو اپنے سر پہ بادل ساکت دکھائی دیے جب کہ مینار، گنبد اور میں نے اپنے آپ کو تیزی سے گھومتا محسوس کیا۔ میرے ایک ہاتھ پر ہرے بھرے کھیت اور مکانات کا سلسلہ تھا جب کہ دوسرے پر جھلملاتا ہوا سمندر۔ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

پروفیسر چاہتے تھے کہ میں سیدھا کھڑا رہوں اور چاروں طرف دیکھوں۔ یہ میرا پہلا سبق تھا جو ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر جب انھوں نے مجھے نیچے اترنے کی اجازت دی تو میں کسی نہ کسی طرح سے نیچے پہنچا۔ اس وقت میں مشکل ہی سے کھڑا ہو پا رہا تھا۔

"کل ہم یہ مشق دوبارہ کریں گے۔" پروفیسر نے کہا۔

ہم اس مینار پر پانچ دن تک چڑھنے اور اترنے کی مشق کرتے رہے۔ اس سے میرے حوصلے اور ہمت میں خاصا اضافہ ہو گیا۔

بالآخر ۲/جون کی صبح آ پہنچی۔ اس وقت تک ہم نے رکیاوک کی مشہور شخصیتوں کے نام تعارفی خطوط حاصل کر لیے تھے جن میں آئس لینڈ کا گورنر بھی شامل تھا۔ اس صبح ہمارا سامان والکائر نامی جہاز پر چڑھا دیا گیا۔ چند منٹ بعد جہاز نے ساحل چھوڑ دیا اور کھلے سمندر میں تیرنے لگا۔ پھر ایک گھنٹے بعد وہ سویڈن اور ڈنمارک کی آبنائے میں داخل ہو چکا تھا۔

"ہم کب تک اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے؟" چچا جان نے کپتان سے پوچھا۔

"اگر ہمیں کسی طوفان کا سامنا نہ کرنا پڑا تو دس دن لگیں گے۔" کپتان نے جواب دیا۔

"ہمیں تاخیر تو نہیں ہو جائے گی؟"

"پروانہ کرو پروفیسر ہم صحیح وقت پر پہنچ جائیں گے۔"

شام تک جہاز ڈنمارک کے شمالی حصے کی طرف تھا اور رات کے وقت ناروے کے جنوبی حصے تک پہنچ چکا تھا اس کے بعد وہ شمالی سمندر میں داخل ہوا۔ دو دن بعد ہمیں اسکاٹ لینڈ نظر آیا پھر ہم بحر اوقیانوس میں پہنچ گئے' میں اپنے کیبن میں آرام سے تھا مگر چچا جان جو شروع سے ہیجان میں مبتلا تھے اور جنھیں چاہیے تھا کہ وہ کپتان سے آئس لینڈ کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں' اپنے کیبن میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔

۱۱/جون کو ہمارا جہاز کیپ پورٹ لینڈ کے قریب سے گزرا' پھر ۱۳/جون کو رکیاوک کے نزدیک خلیج میں لنگر انداز ہو گیا۔ پروفیسر اپنے کیبن سے نکل آئے۔ ان کا چہرہ زرد تھا اور اس پر ہمیشہ کی طرح فکر و تردّد کے سایے تھے۔ وہ مجھے گھسیٹ کر آگے لے گئے اور انھوں نے ایک پہاڑ کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا اور چیخنے لگے "سینی فلز..... سینی فلز۔"

جہاز ٹھہر چکا تھا اس لیے ہم ایک کشتی میں بیٹھ کر ساحل پر پہنچ گئے اور ہم نے آئس لینڈ کی سرزمین پر قدم رکھا۔ سب سے پہلے ہمیں گورنر دکھائی دیا۔ پروفیسر نے اسے وہ خط دیا جو وہ کوپن ہیگن سے لائے تھے۔ گورنر نے خط پڑھا اور ہماری مدد کرنے کی ہامی بھری۔ وہ رکیاوک کے میئر اور رکیاوک اسکول کے ایک سائنس کے استاد مسٹر ڈکسن نے چچا جان

کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ پھر وہ ہمیں ٹھہرانے کے لیے اپنے گھر لے گئے۔

"البرٹ پریشانی ختم ہو گئی۔" چچا جان نے مجھ سے کہا۔

"ختم ہو گئی؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ سفر ختم ہو گیا اور بس اب ہمیں زمین کی تہ میں جانا ہے۔"

"لیکن جب ہم نیچے جائیں گے تو ہمیں واپس اوپر بھی تو آنا ہو گا؟"

"اوہ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔"

پروفیسر لائبریری میں چلے گئے تاکہ آرنی کے بارے میں لکھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ سکیں جب کہ میں قصبے کی طرف گھومنے نکل گیا۔ رکیاوک میں دو ہی سڑکیں تھیں اور میں انھی پر چل رہا تھا اس لیے میں راستہ نہیں بھول سکتا تھا۔ تین گھنٹوں میں میں نے وہاں کی تمام چیزیں دیکھ لیں۔ قصبہ اور گرد و نواح کا سارا علاقہ میں نے گھوم کر دیکھ لیا۔ وہاں زیادہ تر آتش فشاں پہاڑوں کا لاوا یا ان کی خالی چٹانیں تھیں، جن پر کوئی درخت یا جھاڑی نہیں تھی۔ گھاس پھوس اور مٹی سے بنی ہوئی کچھ جھونپڑیاں بھی نظر آئیں۔ وہاں کے بازار میں لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو مچھلیوں کی خرید و فروخت کر رہے تھے۔ مرد طاقتور اور توانا تھے، مگر بد وضع اور بد مزاج۔ مسکراہٹ سے ناآشنا۔ ساری دنیا سے کٹے ہوئے اس برفانی خطے میں قیام پذیر۔ وہاں کی عورتیں دل کش تھیں، مگر ان کے چہروں سے افسردگی جھلکتی تھی۔ مردوں کی طرح انھوں نے بھی سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔

میں مسٹر ڈکسن کے گھر لوٹ آیا جہاں میں نے انھیں اور چچا جان کو ساتھ بیٹھے دیکھا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا اس لیے ہم تینوں ڈائننگ ہال میں چلے گئے۔ چچان جان نے دلیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے دوران گفتگو ہوتی رہی۔ وہ صرف آئس لینڈ کی زبان میں گفتگو کرتے رہتے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آتا لیکن ڈکسن لاطینی اور چچا جان جرمنی زبان کے الفاظ بھی استعمال کر رہے تھے۔ اس لیے میری سمجھ میں بھی کچھ نہ کچھ آ رہا تھا۔ "تم میری

لائبریری میں کیسی کتابیں تلاش کر رہے ہو؟ مجھے بتاؤ تاکہ میں تمھاری مدد کر سکوں؟" ڈکسن نے چچا سے پوچھا۔

میں نے چچا جان کی طرف دیکھا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ بالآخر انھوں نے کہا "مسٹر ڈکسن میں آرنی کی کتابیں پڑھنا چاہتا ہوں۔"

"آرنی!" رکیاوک کے استاد نے دُہرایا۔ "تمھارا مطلب ہے سولھویں صدی کا کیمیاداں جو سیّاح بھی تھا؟"

"یقیناً"

"اس کی کتابیں ادب اور سائنس کے طالب علموں کے لیے سرمایہ ہیں۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اس سے اچھی طرح واقف ہو، مگر میں اس کی کتابوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"ہمارے پاس اس کی کتابیں نہیں ہیں۔"

"یہاں آئس لینڈ میں بھی نہیں ہیں۔"

"آئس لینڈ میں نہیں ہیں اور دنیا کے کسی خطے میں بھی ان کے ملنے کا امکان نہیں ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ وہ منکرِ خدا تھا اور چرچ کی تعلیمات کو تسلیم نہیں کرتا تھا چنانچہ ۱۵۷۳ء میں اس کی کتابیں کوپن ہیگن میں جلادی گئیں۔"

"اوہ میں سمجھ گیا کہ آرنی نے اپنی باتوں کو راز میں کیوں رکھا تھا۔"

"کیسا راز؟" مسٹر ڈکسن چونک پڑے۔

"ایک راز..... جو..... جو کہ....."

"کیا تمھارے پاس آرنی کے خفیہ کاغذات ہیں؟"

"نہیں... مم... نہیں... میں تو اندازہ قائم کر رہا تھا۔" چچا جھوٹ بولتے ہوئے ہچکچائے۔

"اوہ اچھا۔" ڈکسن نے کہا اور موضوع تبدیل کر دیا۔ مجھے امید ہے کہ تم آئس لینڈ کی معدنی دولت دیکھے بغیر نہیں جاؤ گے؟"

"یقیناً نہیں۔" چچا جان نے جواب دیا۔ "مگر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ مجھ سے پہلے بھی یہاں دوسرے سائنس داں آ چکے ہیں۔"

"ہاں آ چکے ہیں۔ پروفیسر بروک لیکن ابھی یہاں بہت کچھ ہونا باقی ہے۔"

"تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا ہے؟" چچا نے معصومیت سے کہا۔

"اوہ یہاں بہت سے پہاڑ آتش فشاں اور گلیشئر ایسے ہیں جن کے بارے میں معلومات حاصل کی جانا باقی ہیں۔ مثال کے طور پر اس پہاڑ کی طرف دیکھو' وہ سینی فلز ہے۔

"آہ سینی فلز۔"

"کیا وہ آتش فشانی نہیں کرتا ہے؟"

"وہ پانچ سو سال سے خاموش ہے۔"

"اچھا' ہوں۔" چچا جان بولے اور انھوں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں اس اندیشے کے تحت کہ کہیں وہ فضا میں چھلانگ نہ لگا بیٹھیں۔ "میرا خیال ہے کہ میں اپنے مطالعے اور مشاہدے کا آغاز اس سے کروں۔ سیسی فل..... فیسل..... کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"سینی فلز" مسٹر ڈکسن نے دُہرایا۔

یہ باتیں چونکہ لاطینی میں ہو رہی تھیں اس لیے میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔ چچا جان اپنی خوشی چھپانے کی جو کوشش کر رہے تھے اس پر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

"تمھاری باتوں سے میرے ذہن میں ایک منصوبہ پرورش پا رہا ہے کہ ہمیں اس پہاڑ پر چڑھنے اور اس کا دہانہ دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔" انھوں نے اسکول ماسٹر سے کہا۔

"معاف کرنا اس سفر میں' میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا۔" مسٹر ڈکسن نے معذرت چاہی۔

"اچھا خیر۔" چچا جان نے فوراً کہا۔ "تمھارا شکریہ۔ مگر ہم تمھیں زحمت نہیں دینا چاہتے۔"

"تم سینی فلز تک کیسے جاؤ گے؟" ہمارے میزبان نے پوچھا۔

"ہم کشتی کے ذریعہ خلیج کو پار کریں گے۔ میرے خیال میں یہی سب سے چھوٹا راستہ ہے!"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ رکیاوک میں تمھیں کوئی ایسی کشتی نہیں ملے گی۔ تم کو زمینی سفر کرنا پڑے گا' اس لیے ساحل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرو۔"

"ٹھیک ہے' میں کسی گائڈ کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں ایک اچھے' مستقل مزاج اور شکاری شخص کا نام اس سلسلے میں تجویز کر سکتا ہوں وہ سینی فلز کے نزدیک ہی رہتا ہے۔ ڈنمارک کی زبان اچھی طرح سے بول سکتا ہے۔"

"اس سے کب ملاقات ہو سکتی ہے؟" چچا نے اشتیاق ظاہر کیا۔

"اگر تم چاہتے ہو تو کل ہی ہو سکتا ہے۔"

"آج کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ وہ کل سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔"

"ٹھیک ہے کل سہی۔" چچا نے مایوسی سے گہرا سانس لے کر کہا۔

# ہمارا گائیڈ ہانس

دوسری صبح جب میں بیدار ہوا تو میں نے دوسرے کمرے سے چچا جان کی آواز آتی سنی جو کسی سے اونچے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ میں بستر سے اٹھا اور ان کے پاس چلا گیا۔ وہ ڈینش زبان میں ایک دراز قامت' مضبوط جسم والے آدمی سے باتیں کر رہے تھے جس کے بال سُرخ تھے اور نیلی آنکھوں سے ذہانت جھلک رہی تھی۔ وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور چچا جان کی پُرجوش باتوں سے قطعی متاثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جب وہ "نہیں" کہنا چاہتا تو اپنا

سر دائیں بائیں ہلا دیتا اور جب "ہاں" کہنا چاہتا تو اپنا سر اتنی آہستگی سے آگے جھکا دیتا کہ اس کے لمبے بالوں میں حرکت تک نہ ہوتی۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ آدمی شکاری ہو سکتا ہے' مگر مسٹر ڈکسن نے وضاحت کی کہ وہ ایک خاص قسم کی بطخ کا شکار کرتا ہے اور وہ بھی صرف اس کے پروں کے لیے۔ بطخ یہ کام اس کے لیے خود بھی کر ڈالتی ہے کیونکہ وہ اپنے پروں کو نوچنے کی عادی ہوتی ہے۔

یہ شکاری جس کا نام ہانس تھا' سینی فلز کے دامن میں واقع گاؤں اسٹاپی تک ہماری رہنمائی کرنے والا تھا۔ ہمیں ۱۶ر جون تک اپنا سفر شروع کرنا تھا' یہ سفر سات یا آٹھ دن کا تھا۔ چچا کو' مجھے اور ہمارے سامان کو گھوڑوں پر جانا تھا جب کہ ہانس نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

طے یہ پایا تھا کہ اسٹاپی پہنچنے کے بعد بھی اگر چچا جان کو ضرورت ہوئی تو وہ اسے اپنے ساتھ رکھیں گے اور اس سے کام لیتے رہیں گے' اس معاہدے کے ساتھ کہ وہ اسے ہر ہفتے کی شام تین ڈالر بطور معاوضہ ادا کرتے رہیں گے۔

یہ معاہدہ نہایت آسانی سے طے پا گیا۔

"یہ نہایت شاندار آدمی ہے۔" چچا جان نے ہانس کے جانے کے بعد کہا۔

"تو یہ ہمارے ساتھ چلے گا اور....."

"ہاں البرٹ۔ یہ ہمارے ساتھ دنیا کی تہ تک جائے گا۔" چچا جان نے میرا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

وہ جون کی ۱۴ر تاریخ تھی اس لیے ہم سارا دن اپنا سامان باندھتے رہے۔

سب آلات مثلاً حرارت پیما' قطب نما اور آلۂ دباؤ وغیرہ ایک بکس میں۔ دوسرے میں بندوقیں اور ریوالور۔ تیسرے میں کلہاڑیاں' ہتھوڑیاں' فولادی سلاخیں اور رسیاں وغیرہ پیک کی گئیں۔ جب کہ چوتھے میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں جو اتنی تھیں کہ ہم چھے مہینے تک انھیں استعمال کر سکتے تھے۔ مشروب کے طور پر چچا جان نے ایک قسم کی

شراب رکھی تھی۔ وہ اپنے ساتھ پانی نہیں لے جا رہے تھے۔ ان کو توقع تھی کہ پانی کسی زیرِ زمین چشمے سے مل جائے گا۔

اس کے علاوہ ہمارے پاس دوائیں، تمباکو، رقم اور واٹر پروف جوتوں کے چھے جوڑے تھے۔

"ان کے ذریعے ہم ایک لمبا سفر کر سکیں گے۔" چچا جان نے کہا۔

اس شام ہم نے گورنر اور میئر کے ساتھ کھانا کھایا۔ چچا جان ان سے بات چیت میں مصروف رہے، لیکن ان لوگوں کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔

۱۶ر جون کو ہم نے سارا سامان باندھ لیا۔ ہمارے میزبان مسٹر ڈکسن نے چچا کو آئس لینڈ کا ایک اچھا سا نقشا دیا۔ وہ شام ہم نے خوش گوار باتوں میں گزاری۔ مجھے معلوم تھا کہ اب جو رات آئے گی وہ اتنی خوش گوار نہیں ہو گی۔

اگلے دن صبح پانچ بجے گھوڑوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے پھرتی سے اپنا لباس تبدیل کیا اور نیچے سڑک پر گیا۔ وہاں ہانس مستعدی سے سامان کا آخری بکس گھوڑوں پر رکھوا رہا تھا۔ چچا جان اس کا ہاتھ کم بٹا رہے اور حکم زیادہ دے رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہانس ان کے احکامات پر کم ہی توجہ دے رہا ہے۔

چھے بجے تک ساری تیاری مکمل ہو گئی تو مسٹر ڈکسن نے ہم لوگوں سے مصافحہ کیا۔ میرے چچا نے آئس لینڈ کی زبان میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ جب کہ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میں نے لاطینی زبان استعمال کی۔ پھر ہم نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ "جاؤ، جہاں تک تمھاری قسمت ساتھ دے۔" مسٹر ڈکسن نے اونچی آواز میں کہا۔

ہانس گھوڑوں کے آگے آگے چل رہا تھا اور اس کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ تھکا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے دو گھوڑے تھے جن پر سامان لدا ہوا تھا اور اس کے بعد گھوڑوں پر ہم دونوں تھے۔ رکیاوک سے نکلتے ہی ہانس ساحل کے کنارے چلنے لگا۔ وہاں

کھیت اور چراگاہیں تھیں، مگر افسوس کہ وہ ہرے بھرے ہونے کے بجائے پیلے اور زرد تھے۔ ان کی گھاس اور پودے مُرجھائے ہوئے تھے۔ ان کھیتوں میں چند بھیڑوں اور اِکّادُکّا کوّوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ مشرق کی طرف پہاڑوں پر دُھند اور کہر تھی۔ جب کہ ان سے بھی پیچھے والے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی جو دور سے چمک رہی تھی۔

میں نے پلٹ کر چچا کی طرف دیکھا تو مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کا قد لمبا تھا اور جس گھوڑے پر وہ بیٹھے تھے وہ چھوٹا تھا اس لیے عجیب سے لگ رہے تھے۔ "اچھا گھوڑا ہے، بہت اچھا گھوڑا ہے" وہ مسلسل کہہ رہے تھے۔ "البرٹ، تمھیں آئس لینڈ کے گھوڑوں کے مقابلے میں کوئی اور گھوڑا اتنا ذہین اور جفاکش نہیں ملے گا۔ بادل ہو کہ بجلی، طوفان ہو کہ چٹان یا برفانی تودے یہ کہیں نہیں ٹھہرتا، ہر ایک کو پھلانگتا چلا جاتا ہے۔ ایک دن میں یہ تیس میل کا فاصلہ طے کرتا ہے۔"

رکیاوک سے چلے ہوئے جب دو گھنٹے ہو گئے تو ہم ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچ گئے۔ ہانس تھوڑی دیر کے لیے رُک گیا۔ پھر اس نے ہمارے ساتھ ناشتہ کیا۔ چچا نے راستے کے بارے میں اس سے جو کچھ پوچھا وہ مختصر انداز میں ہاں یا نہیں میں اس کا جواب دیتا رہا۔

اس وقت چار بجے تھے اور ہم نے بیس میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ وہاں ایک کھاڑی تھی جو تقریباً دو میل چوڑی تھی۔ اس کی لہریں چٹانوں سے ٹکرا کر جھاگ اُڑا رہی تھیں۔

"اگر یہ گھوڑے واقعی ذہین ہیں تو پھر سمندر کو پار کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔

مگر چچا جان نے میری ایک نہ سنی اور اپنے گھوڑے کو دانٹ ڈپٹ کر سمندر میں اترنے پر مجبور کیا، جس کے نتیجے میں گھوڑے نے انھیں اپنی پیٹھ سے اُچھال دیا۔

"سمندر پار کرنے کے لیے کشتی مل جائے گی۔" گائیڈ نے کہا۔

"ارے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔" چچا نے چونک کر کہا۔ "آؤ کشتی سے چلیں۔"

"ابھی سمندر میں لہریں اُٹھ رہی ہیں اس لیے ٹھہرنا پڑے گا۔"

چچا بے چینی سے ٹہلنے لگے' مگر اس سے مسئلہ حل نہیں ہوا۔ معاملہ جوں کا توں رہا۔ سمندر میں لہروں کا زور شام کو چھے بجے ٹوٹا۔ اس وقت جب وہ پُر سکون ہو گیا تو دو آدمیوں نے ایک گھنٹے میں ایک کشتی میں ہمیں دوسری طرف پہنچا دیا۔ ساڑھے سات بجے ہم فورڈ پہنچ گئے جہاں ہمیں رات بھر ٹھہرنا تھا۔

شام کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اندھیرا ہو گیا تھا۔ روشنی اب بھی ہو رہی تھی اس لیے کہ آئس لینڈ میں جون اور جولائی کے دوران سورج غروب نہیں ہوتا۔ بہر حال درجہ حرارت کافی کم ہو گیا تھا۔ جب ہم ایک غریب کسان کے دروازے پر جا کر ٹھہرے تو اس وقت مجھے بھوک اور سردی ستا رہی تھی۔

مالکِ مکان نے ہم سے ہاتھ ملایا اور پھر ہمیں سیدھا خواب گاہ میں لے گیا جہاں کچا فرش تھا اور لیٹنے کے لیے بھوسا بھرے ہوئے دو گدّے پڑے تھے۔ اس نے ہمیں باورچی خانے تک چلنے کو کہا' چاروں کمروں میں وہی ایک جگہ تھی جہاں آگ جل رہی تھی۔ جب ہم باورچی خانے میں گئے تو میزبان اور اس کی بیوی نے کہا "خوش آمدید' تم لوگ خوش رہو۔" ان کے اُنتیس بچے ہمارے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد چار ہماری گردنوں پر سوار تھے۔ ایک دو گھٹنوں پر اور باقی گود میں بیٹھے تھے۔

پھر ہم چوبیسوں کھانا کھانے بیٹھے۔ کھانا بہت عجیب تھا۔ مچھلی اور لسی تھی۔ مجھے بہر حال زور کی بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں ساری مچھلی کھا گیا اور ساری لسّی پی گیا۔

دوسرے دن صبح پانچ بجے ہم نے اپنے میزبانوں کو الوداع کہا اور اسے رات گزارنے کے کرایے کے طور پر رقم دینا چاہی جو اس نے مشکل ہی سے قبول کی۔

سفر شروع کرتے ہی احساس ہوا کہ آگے ویرانی ہے۔ راستے میں بہت کم انسان یا جانور دیکھنے کو ملے۔ فورڈ کا علاقہ طے کرنے کے بعد ہم نے رات ایک ویران جھونپڑی میں

بسر کی۔ دوسرے روز بھی یہی منظر دکھائی دیا' مگر ہم نے کافی فاصلہ طے کر لیا اور رات کے وقت ہم اسٹاپی سے آدھے فاصلے پر پہنچ گئے۔

۱۹ر جون کو ہم آتش فشاں سے نکلے ہوئے مردہ لاوے پر چل رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد نمی شروع ہو گئی۔ اب ہم خلیج فیکسا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے اور سینی فلز کی سفید چوٹیاں جو بادلوں میں لپٹی ہوئی تھیں ہم سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر رہ گئی تھیں۔ مجھ پر رفتہ رفتہ تھکن سوار ہو رہی تھی' لیکن چچا جان اسی طرح سے تازہ دم تھے جیسے کہ رکیاوک سے چلتے وقت تھے۔ ہمارا گائڈ بھی اس سفر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

۲۰ر جون ہفتے کی شام کو ہم بوڈیر نامی گاؤں کے قریب پہنچ گئے جو ساحل سمندر پر واقع تھا۔ وہاں چچا جان نے ہانس کو طے شدہ معاہدے کے مطابق رقم ادا کی۔ وہ رات ہم نے ہانس کے خاندان کے ساتھ گزاری جو اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ دوسری صبح ہم لوگ پھر چل پڑے۔ اب ہم سینی فلز کے بہت قریب پہنچ چکے تھے اور پروفیسر کی نگاہیں پہاڑ سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ ''خوب تو یہ ہے وہ دیو قامت پہاڑ جسے میں شکست دینے والا ہوں۔'' انھوں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

چار گھنٹے بعد گھوڑے اسٹاپی کے علاقے میں داخل ہوئے اور پھر ایک کیبن کے دروازے پر پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ اسٹاپی میں تقریباً تیس کیبن تھے' اس کے پیچھے پہاڑ شروع ہو جاتا تھا اس لیے وہاں قدرتی طور پر تیس فیٹ اونچی ایک چٹان دیوار کی طرح کھڑی ہو گئی تھی۔ وہاں ہمیں جو کیبن رہنے کے لیے ملا وہ بہت گندا اور بے ترتیب تھا اور اس کا مالک ایک گنوار انسان تھا جو شراب بہت پیتا تھا۔ چچا جان چاہتے تھے کہ وقت ضائع کیے بغیر جلد از جلد سفر شروع کیا جائے اس لیے ہانس نے دوسرے دن تین آدمیوں کی خدمات حاصل کیں جنھیں ہمارا سامان اٹھا کر پہاڑ کے دہانے کے اندر جہاں تک ہو سکے پہنچانا تھا۔

میں اس بات سے پریشان تھا کہ ممکن ہے آتش فشاں سینی فلز مردہ نہ ہو اور جب

ہم لوگ دہانے پر پہنچیں تو وہ اچانک جاگ جائے اور لاوا اُگلنا شروع کر دے۔ میں نے اپنے اس خدشے سے چچا جان کو آگاہ کیا۔

"میں بھی اس بارے میں سوچ رہا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

کیا واقعی وہ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے اور اس سفر کو ترک کرنے والے تھے؟

"میں اس بارے میں سوچ رہا تھا۔" انھوں نے اپنی بات دُہرائی۔ "سینی فلز گذشتہ چھے سو سال سے خاموش ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ اچانک پھٹ پڑے۔ مگر آتش فشاں کے پھٹنے سے پہلے زمین میں جو تبدیلی آتی ہے اور اس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں وہ نہیں ہو رہے ہیں۔ میں نے اس معاملے پر قصبے والوں سے بھی بات کی ہے اور خود بھی زمین کا مشاہدہ کیا ہے۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ البرٹ کہ آتش فشاں کے پھٹنے کے امکانات نہیں ہیں۔"

میں حیرت سے گنگ رہ گیا۔

"تمھیں میری بات کا یقین نہیں آیا۔" چچا جان نے کہا "اچھا میرے ساتھ آؤ۔"

ہم کیبن سے نکل آئے اور سمندر سے کافی دور ایک شگاف سے اندر گئے۔ وہاں آتش فشانی چٹانوں سے جگہ جگہ بھاپ اٹھ رہی تھی۔

"تم اس بھاپ کو دیکھ رہے ہو البرٹ؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آتش فشاں نہیں پھٹے گا۔"

"میں سمجھ نہیں پایا کہ اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے؟"

"سنو۔" پروفیسر نے کہا "آتش فشاں پھٹنے والا ہوتا ہے تو یہ بھاپ زیادہ مقدار میں نکلنے لگتی ہے اور اطراف کی ہوا ساکت اور بھاری ہو جاتی ہے۔"

"مگر....."

"اس میں اگر مگر کی گنجایش نہیں ہے۔ میں نے تمھیں ایک سائنسی اصول بتایا ہے۔ اس کے سامنے کسی شخص کو اپنی زبان نہیں کھولنا چاہیے۔"

میں چچا جان کے ساتھ کیبن واپس آگیا۔ میں خود کو مضمحل محسوس کر رہا تھا۔ اب لے دے کے یہی امید رہ گئی تھی کہ جب ہم آتش فشاں کے دہانے کے نیچے پہنچیں اور اپنے سفر کا آغاز کرنے لگیں تو ہمیں راستہ نہ ملے۔ اس رات مجھے بھیانک خواب نظر آتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ آتش فشاں ایک ہول ناک آواز کے ساتھ پھٹ گیا ہے اور میں فضا ہی میں اس کے لاوے میں جل بھن کر مر گیا ہوں۔

دوسرے دن ۲۳ر جولائی کو ہانس تین آدمیوں کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے سامان میں اس نے چمڑے کی ایک بوتل کا اضافہ کیا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ یہ پانی ہمارے ذخیرے کے علاوہ تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پانی کا یہ ذخیرہ ایک ہفتے کے لیے کافی ہو گا۔

صبح نو بجے جب ہم رخصت ہونے لگے تو چچا جان نے میزبان کو منہ مانگی رقم ادا کر دی۔

# سینی فلز پر چڑھائی

سینی فلز پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ جب ہم بالکل اس کے دامن میں پہنچ گئے تو میں نے سر اٹھا کر اس کی چوٹی کو دیکھنا چاہا' لیکن خاکستری آسمان کے پس منظر میں وہ نظر نہیں آئی۔ مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے پہاڑ نے برف کی ٹوپی پہن رکھی ہو۔

ہانس کی رہنمائی میں ہم ایک تنگ راستے پر آگے پیچھے چلے جا رہے تھے' وہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ دو آدمی برابر نہیں چل سکتے تھے۔ اس لیے ایک دوسرے سے بات چیت بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہم جس راستے سے گزر رہے تھے اس کے اطراف کا نظارہ کرنے کے لیے میرے پاس کافی وقت تھا۔ جیسے جیسے میرے مشاہدے میں اضافہ ہو رہا تھا' ویسے ویسے میرا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔ بلاشبہ وہ آتش فشاں پہاڑ تھا' وہاں پائی جانے والی حدت کی وجہ سے کوئی احمق ہی اس کے دہانے سے اندر اترنے کی کوشش کرے گا۔

رفتہ رفتہ راستہ دشوار ہوتا چلا گیا۔ چڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ چٹانیں ہمارے قدموں تلے دب کر ٹوٹ رہی تھیں اور یہ صورت حال بے حد خوف ناک تھی!

ہانس اس چڑھائی کو اس طرح سے طے کر رہا تھا جیسے کسی ہموار جگہ پر چل رہا ہو۔ بعض اوقات وہ کسی بڑی چٹان کے پیچھے غائب ہو جاتا تھا پھر وہ تیز سیٹی بجاتا تو ہمیں معلوم ہوتا کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا کہ اب ہمیں کدھر جانا ہے۔ تین گھنٹے تک چلنے کے بعد ہم پہاڑ کے دامن میں پہنچ سکے۔ وہاں ہانس نے ہمیں ٹھہرنے کا حکم دیا اور پھر سب کو ناشتے کے طور پر تھوڑا تھوڑا کھانے کو دیا۔ چچا جان نے جلدی جلدی کھا لیا اور پھر آرام کرنے لگے اس لیے کہ سب لوگ تھک گئے تھے اور ہانس کی تجویز تھی کہ آرام کرنا مناسب ہو گا۔ طے یہ پایا کہ ایک گھنٹے بعد دوبارہ سفر شروع کیا جائے گا۔ ہانس کے ساتھ آئے ہوئے تین مزدور جن کا تعلق آئس لینڈ سے تھا' وہ ہانس کی طرح ہی تھے۔ وہ بات چیت کم کرتے تھے اور ان کی خوراک بھی کم تھی!

جب سفر دوبارہ شروع ہوا تو سینی فلز کی چڑھائی طے کرنا پڑی۔ سر اٹھا کر دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی چوٹی بے حد قریب ہے' مگر وہاں تک پہنچنے کے لیے ابھی کتنے گھنٹے لگنا تھے' یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ چھوٹے موٹے پتھر اب بھی ہمارے قدموں تلے آ کر پھسلتے ہوئے نیچے جا رہے تھے۔ بعض اوقات ایسی عمودی چٹانیں ہمارے سامنے آ جاتی تھیں کہ ہم ان پر نہیں چڑھ پاتے لہٰذا ہمیں گھوم کر راستہ طے کرنا پڑتا۔ ہمارے ہاتھوں میں نوک دار فولادی سلاخیں تھیں جن کے سہارے ہم راستہ طے کر رہے تھے۔ چچا جان میرے قریب ہی تھے اور انھوں نے کئی موقعوں پر مجھے سہارا دیا۔ وہ نہایت اچھی طرح سے اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھے۔ یہی حال آئس لینڈ کے تین باربردار مزدوروں کا تھا۔ انھوں نے بھاری سامان لاد رکھا تھا' لیکن وہ بہت آسانی سے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد خوش قسمتی سے برفانی راستے پر ہمیں قدرتی زینہ سا مل گیا۔ اس

سے سفر میں آسانی ہو گئی۔ شام تک ہم تقریباً دو ہزار سیڑھیاں چڑھ چکے اور اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں سے سینی فلز کا دہانہ شروع ہوتا تھا۔

اس وقت ہم سمندر سے بتیس سو فٹ کی بلندی پر تھے۔ ہوا تیز اور سرد تھی اور میں بہت تھک چکا تھا۔ چچا حالانکہ جلد بازی کا مظاہرہ کرتے تھے اور ہر وقت ایک ہیجان میں مبتلا تھے، لیکن انھوں نے بھی ٹھہرنے کا فیصلہ کیا اور گائڈ کے سامنے یہ تجویز پیش کی۔ لیکن ہانس نے انکار میں سر ہلایا "اور اوپر" اس نے کہا۔

"کیوں؟" چچا نے پوچھا۔

"گرد و غبار کا طوفان آنے والا ہے؟"

"ہاں۔" باقی تین مزدوروں نے بھی خوف زدہ آواز میں اس کی تائید کی۔

"وہ کیسا ہوتا ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"وہ دیکھو۔" چچا جان نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے اس طرف دیکھا تو گرد و غبار کا ایک بہت اونچا مینار فضا میں بل کھاتا ہوا پہاڑ کی چوٹی کی طرف آتا نظر آیا۔ غبار اتنا تھا کہ سورج اس میں چھپ گیا تھا۔

"جلدی کرو..... بھاگو....." ہانس نے کہا۔

ہم سے جتنا تیز ہو سکا ہم ہانس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ جلد ہی گرد و غبار کا طوفان پہاڑ تک آ گیا۔ چھوٹے بڑے بڑے پتھر ہوا کے زور سے اپنی جگہوں سے پھسلے اور بارش کی طرح سے نیچے برسنے لگے۔ اگر وہ پتھر ہمارے جسموں پر پڑ جاتے تو ہمارے ٹکڑے اُڑ جاتے۔ ہم ہانس کے شکر گزار تھے کہ اس کی وجہ سے بچ گئے۔ اب ہم دوسری طرف تھے اور خطرے سے محفوظ!

مگر ہانس کا خیال تھا کہ وہاں ٹھہرنا دانش مندی نہیں ہے۔ اس لیے ہم مسلسل چڑھائی چڑھتے رہے اور چاروں طرف گھوم کر راستے طے کرتے رہے۔ اس طرح سے باقی ڈیڑھ

ہزار فٹ طے کرنے میں ہمیں تقریباً پانچ گھنٹے لگے۔ سردی اور بھوک کی وجہ سے میں تھکن اور کمزوری محسوس کر رہا تھا اور صحیح طرح سے اتنی بلندی پر سانس نہیں لے پا رہا تھا۔

بالآخر گیارہ بجے رات کو، جب ہر طرف مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہم سینی فلز کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اس کے دہانے میں پناہ لینے سے پہلے مجھے نیچے آدھی رات کا سورج طلوع ہوتا دکھائی دیا۔

ہم نے جلدی سے کھانا کھایا اور سونے کی تیاری کرنے لگے۔ بستر سخت تھا اور لیٹتے وقت مجھے آرام نہیں ملا۔ سمندر سے پانچ ہزار فیٹ کی بلندی پر ایسی پناہ گاہ بھی نہیں مل سکی تھی کہ ہم صحیح طریقہ پر آرام کر سکتے، مگر اس کے باوجود میں سو گیا۔ پھر مجھے اتنی گہری نیند آئی کہ کوئی خواب تک نظر نہیں آیا۔

دوسری صبح بیدار ہونے پر تیز ہوا کی وجہ سے ہاتھ پاؤں منجمد محسوس ہوئے، مگر اطمینان بخش بات یہ تھی کہ سورج طلوع ہو چکا تھا اور چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں پتھر کے بستر سے اٹھ گیا تاکہ اس خوبصورت منظر کو دیکھ سکوں۔

اس وقت میں سینی فلز کی جنوبی چوٹی پر کھڑا تھا۔ وہاں سے آئس لینڈ کا بیشتر علاقہ نظر آ رہا تھا۔ نیچے گہری وادیاں تھیں اور جھیلیں تالاب جیسی دکھائی دے رہی تھیں، جب کہ دریاؤں پر چشموں کا گمان ہوتا تھا۔ میرے دائیں جانب مشرق میں، گلیشئر اور برف سے لدی چوٹیاں تھیں۔ انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بپھرے ہوئے سمندر میں کسی نے لہریے ڈال دیے ہوں۔ جب کہ بائیں جانب مغرب میں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ یہ بتانا دشوار تھا کہ خشکی کہاں ختم ہوتی ہے اور سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ دوری کی وجہ سے خشکی اور سمندر ایک دوسرے میں پیوست لگ رہے تھے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر محو ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہانس اور چچا جان میرے قریب آ گئے۔

"اب ہم سینی فلز کی چوٹی پر پہنچ چکے ہیں۔" چچا نے کہا۔ "یہاں دو چوٹیاں ہیں۔

ہانس ہمیں بتائے گا کہ آئس لینڈ کے رہنے والے اس کو کیا کہتے ہیں جس پر اس وقت ہم کھڑے ہیں۔"

"اسکارٹرس" ہانس بولا۔

میرے چچا نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ "اور اب ہم اس کے اندر داخل ہو کر آگے بڑھیں گے۔" انھوں نے اونچی آواز میں کہا۔

سنی فلز کا دہانہ تقریباً ایک میل چوڑا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی گہرائی تقریباً دو ہزار فٹ ہو گی اور تہہ میں پہنچ کر اس کی چوڑائی کم ہو کر پانچ سو فٹ رہ جائے گی۔ اس لیے اس میں اترنا کوئی مشکل نہیں تھا۔

میں چونکہ آتش فشاں کی چوٹی پر کھڑا تھا لہٰذا مجھے ایک بار پھر اس میں سے نکلنے والے لاوے اور قیامت برپا کرنے والی آگ کا خیال آیا مگر اب میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ ہانس ہماری رہنمائی کرنے لگا اور میں خاموشی سے اس کے پیچھے چلنے لگا۔

اس مخروطی جگہ میں ہم گھومتے ہوئے اترنے لگے۔ اندر جہاں جہاں برف کے تودے اور گلیشیئر تھے وہاں ہانس بہت احتیاط سے راستہ طے کر رہا تھا اور اپنی فولادی سلاخ کو چٹانوں پر مار کر ان کی مضبوطی کا اندازہ کرتا جا رہا تھا۔ بعض جگہوں پر ہم نے ایک دوسرے کو رسی سے باندھ لیا تاکہ اگر کوئی پھسل جائے تو دوسرے اسے بچا سکیں۔

دوپہر کے وقت ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے پہاڑ کا دہانہ ایک دائرے کی صورت میں نظر آ رہا تھا اور اس میں سے آسمان چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کی طرح دکھائی دے رہا تھا، جب کہ ہمارے چاروں طرف اسکارٹرس کی بلندی تھی۔ ہم خود کو کسی کنویں میں کھڑا محسوس کر رہے تھے۔

اس پہاڑ کی تہہ میں تین چمنیاں تھیں۔ آتش فشاں پھٹنے کی صورت میں ان سے لاوا نکلتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک چمنی کا دہانہ تقریباً سو فٹ چوڑا تھا۔ مجھے ان چمنیوں کے

نزدیک جانے کی ہمت نہیں ہوئی، مگر چچا جان ہیجان میں کبھی ایک اور کبھی دوسری چمنی کی طرف دوڑتے تھے۔ جذبات میں وہ بڑبڑاتے اور ہاتھ پاؤں ہلاتے جا رہے تھے۔ ہانس اور میں خشک لاوے کے بلاکوں پر بیٹھ گئے اور انھیں دیکھنے لگے۔ ہم دونوں کا خیال تھا کہ ان کا دماغ چل گیا ہے۔

اچانک چچا جان چلائے۔ پہلے مجھے خیال ہوا کہ وہ ان میں سے کسی دہانے میں گر گئے ہیں، مگر پھر میں نے انھیں مسرت سے ہاتھ پھیلائے گرینائٹ کی ایک چٹان کے سامنے کھڑا دیکھا۔ "البرٹ!.... البرٹ۔" انھوں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "یہاں آؤ۔ یہاں آؤ۔"

میں دوڑ کر ان کے قریب گیا جب کہ ہانس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

"یہ دیکھو۔" چچا جان نے کہا۔

میں نے ان کے جوش و خروش سے مجبور ہو کر اس چٹان کی طرف دیکھا تو اس پر ایک منحوس نام کھدا ہوا نظر آیا۔ آرنی سیکنسم! "کیا اب بھی تمھیں کوئی شبہ ہے؟" انھوں نے میرا شانہ ہلا کر کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور جا کر دوبارہ ہانس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر جب میں نے تھوڑی دیر بعد اپنا سر اٹھایا تو وہاں صرف چچا جان اور ہانس نظر آئے۔ بار برداری کے لیے آنے والے تینوں مزدور واپس جاتے دکھائی دیے۔

ہانس ایک چٹان کے نیچے سکون سے سو رہا تھا جب کہ چچا جان آتش فشاں کی تہ میں کسی چوپائے کی طرح بے قراری سے چکر کاٹ رہے تھے۔ مجھے ان کے قریب جانے کی خواہش نہیں تھی اور نہ ہی ہمت۔ اس لیے میں بھی سو گیا، مگر بے سکونی رہی۔ مجھے اس خیال نے پریشان کر رکھا تھا کہ آتش فشاں کسی بھی لمحے کانپنے لگے گا اور لاوا پھٹ پڑے گا۔

آتش فشاں میں یہ ہماری پہلی رات تھی!

دوسرے دن پہاڑ کے دہانے سے جتنا آسمان نظر آیا اس پر گہرے خاکستری بادل

تھے۔ میں نے اس طرف مجبوراً دیکھا تھا اس لیے کہ چچا غصّے سے بڑبڑا رہے تھے۔ وہ تین راستے جو اب ہمارے قدموں تلے تھے آرنی ان میں سے کسی ایک میں گیا تھا' وہ راستہ جس پر نقشے کے مطابق جون کے آخر میں اسکارٹرس کا سایہ پڑتا ہے۔ انھیں اس بات کا غصہ تھا کہ اگر سورج نہیں نکلا تو پھر پہاڑ کی چوٹی کا سایہ نیچے کیسے پڑے گا۔ اس روز پچیس جون تھا۔ اگر آسمان پر چھے روز تک بادل چھائے رہتے تو اس بارے میں کچھ پتا نہ چلتا اور معاملہ اگلے سال پر چلا جاتا!

دن تیزی سے گزر رہا تھا' مگر بادل چھائے ہوئے تھے اور دھوپ اندر تک نہیں آ رہی تھی۔ ہانس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی البتہ اسے حیرت تھی کہ ہم وہاں رک کر کیا کر رہے ہیں۔ چچا جان نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھتے رہے۔

چھبیس جون کو بھی سورج نظر نہیں آیا اور سارا دن بارش ہوتی رہی۔ ہانس نے لاوے کی چٹانوں کو جوڑ کر چھوٹی سی جھونپڑی بنالی جب کہ میں خوش ہو کر آسمان کو دیکھتا رہا' ہلکی ہلکی بارش دہانے سے اندر آ رہی تھی۔ میرے چچا اس صورتِ حال سے دل برداشتہ تھے۔

ستائیس جون کو بھی یہی صورت رہی' مگر اٹھائیس تاریخ کو موسم تبدیل ہونا شروع ہوا۔ بادل چھٹ گئے اور پہاڑ کے دہانے سے سورج دکھائی دینے لگا۔ دھوپ اندر آ رہی تھی اور ہر چٹان اور ہر پتھر کا سایہ تہ پر پڑ رہا تھا۔ اسکارٹرس کا سایہ واضح تھا اور کسی بلیڈ کی طرح سے نوکیلا' وہ سورج کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہا تھا۔

میرے چچا بھی اس کے ساتھ چل رہے تھے۔

آدھا دن گزرنے کے بعد اس چٹان کا سایہ بیچ والی چمنی پر پڑنے لگا۔

"وہ رہا وہ رہا۔" چچا جان چلائے۔ "اس راستے سے ہم زمین کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں۔"

میں نے ہانس کی طرف دیکھا۔

"آگے چلیں؟" ہانس نے پوچھا۔

"ہاں آگے چلو۔" چچا بولے۔

اس وقت ایک بج کر تیرہ منٹ ہوئے تھے۔

# سرنگ سے نیچے

اصل سفر اب شروع ہونے والا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آئیں گی۔ میں نے ابھی تک گہرے کنویں میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا' لیکن اب تو مجھے اس میں اتر کر سفر کرنا تھا۔ ہانس پُر سکون تھا اور اس پر گھبراہٹ طاری نہیں ہوئی تھی' اس کا اطمینان دیکھ کر مجھے اپنے خوف پر شرم آنے لگی۔ میں نے اپنا دل مضبوط کیا اور بیچ والے راستے کی طرف بڑھا۔

میں نے ایک چٹان کا سہارا لے کر اس گہرے سرنگ نما راستے میں جھانک کر دیکھا۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ اگر ہانس نے مجھے پیچھے سے نہ سنبھال لیا ہوتا تو میں اس میں گر پڑتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوپن ہیگن کے چرچ کی بلندی طے کرتے ہوئے میں نے کوئی سبق نہیں لیا۔

میں اس سرنگ پر ایک نظر ہی ڈالنے میں کامیاب ہو سکا تھا' مگر جو کچھ دکھائی دیا اس سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی دیواریں تقریباً عمودی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں اترتے ہوئے ہم ان دیواروں پر موجود لاوے پر پاؤں ٹکا سکتے تھے' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہم اپنا توازن کیسے برقرار رکھ سکیں گے؟ اس میں زینہ بھی تھا' مگر اس کی ریلنگ غائب تھی۔ اگر سرنگ کے اوپری حصے میں کسی چٹان سے ایک رسّی باندھ دی جاتی تو ہم اس کے سہارے اتر سکتے تھے' لیکن یہ بات پریشان کر رہی تھی کہ جب ہم آخری حصے میں پہنچیں گے تو کیا ہوگا؟"

چچا جان نے اس مسئلے کو حل کر دیا۔ انھوں نے چار سو فٹ لمبی ایک رسّی لی جو انگوٹھے کے برابر موٹی تھی' اسے ایک چٹان کے گرد لپیٹا اور اس کے دونوں سرے نیچے پھینک دیے۔ اس طرح سے ہم دو سو فٹ کا فاصلہ طے کر سکتے تھے۔ اس کے بعد ہم رسّی کا ایک سرا پکڑ کر گھسیٹ لیتے اور پھر کسی چٹان پر اسے لپیٹ کر اس کے دونوں سرے نیچے پھینک دیتے۔

"اور اب ہم میں سے ہر ایک اپنی پیٹھ پر ایک تھیلا رکھے گا۔ ہانس کی پیٹھ پر اوزاروں کا تھیلا ہو گا اور تم البرٹ آگ بجھانے والے اوزار اپنی پیٹھ پر رکھو گے جب کہ میں نازک اوزار لے کر اتروں گا۔"

"مگر کپڑوں کا تھیلا اور رسّی کا بنڈل کون لے جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ خود لیتے جائیں گے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"تم خود ہی دیکھ لو گے۔"

چچا جان عجلت پسند ہیں۔ ان کی ہدایت پر ہانس نے کپڑوں اور رسیوں کا ایک بنڈل بنایا اور سرنگ سے نیچے پھینک دیا۔ وہ بنڈل جب نیچے سے جا کر سطح سے ٹکرایا تو ہلکے سے دھماکے کی آواز آئی۔ چچا نے جھک کر جائزہ لیا پھر اطمینان سے بولے "ٹھیک ہے' اب ہماری باری ہے۔"

اس جملے کو سن کر میں خوف سے کانپ گیا۔

ہم نے سامان کے تھیلے پیٹھ پر باندھ لیے اور اترنا شروع کر دیا۔ ہانس سب سے آگے تھا' اس کے بعد چچا اور پھر میں تھا۔ وہاں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی البتہ جب ہمارے پاؤں کے نیچے سے کوئی پتھر نکل کر گہرائی میں گرتا تھا تو شور مچ جاتا۔

میں نے ایک ہاتھ سے دُہری رسّی تھامی اور دوسرے میں فولادی سلاخ اور خود کو نیچے گرانا شروع کر دیا۔ اس رسّی میں تین افراد لٹکے ہوئے تھے اس لیے مجھے اس کے ٹوٹنے

کا اندیشہ تھا لہٰذا میں اس پر زور نہیں دے رہا تھا اور ہلکے ہاتھ سے تھامے ہوئے تھا جب کہ میں ہاتھوں کی جگہ ٹانگوں سے کام لے رہا تھا اور لاوے پر پاؤں جما جما کر اتر رہا تھا۔

"ہوشیاری سے!" ہانس اس وقت بے اختیار کہہ اٹھا جب کوئی پتھر اس کے قدموں کے نیچے سے پھسل کر گہرائی میں گر پڑتا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم ایک مضبوط چٹان کے قریب پہنچ گئے جو سرنگ کی دیوار میں پیوست تھی۔ ہم تینوں اس چٹان پر کھڑے ہو گئے تو ہانس نے رسّی کا ایک سرا پکڑ کر کھینچا' دوسرا سرا جو اوپری چٹان سے لپٹا ہوا تھا لاوے اور پتھروں کے ساتھ نیچے آ گیا۔

میں نے نیچے نگاہ ڈالی' اس سرنگ نما راستے کی تہ اب بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اس طریقے سے مزید دو سو فٹ نیچے اتر گئے۔ یقیناً ایسے نازک موقع پر کوئی ماہر ارضیات چٹانوں کا مشاہدہ و مطالعہ نہیں کر سکتا' اس لیے میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی' مگر ایسا معلوم ہوتا جیسے پروفیسر بروک چٹانوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ جب ہم ایک مرتبہ ایک چٹان پر رکے تو انھوں نے کہا "میں جیسے جیسے نیچے جا رہا ہوں میرا اعتماد بڑھتا جا رہا ہے۔ ان آتش فشانی چٹانوں سے پتا چلتا ہے کہ ہمفرے ڈیوی صحیح تھا۔ میں اس تھیوری سے متفق نہیں ہوں کہ جیسے جیسے ہم زمین کی تہ کی طرف بڑھیں گے ویسے ویسے گرمی بڑھتی جائے گی۔"

وہ ہمیشہ اس نکتے پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتے جب کہ میں ان سے بحث نہیں کرتا تھا۔ میری خاموشی پر وہ یہ تاثر لیتے کہ میں ان سے متفق ہوں۔

تین گھنٹے اس رسّی کے سہارے پھسلنے کے بعد بھی مجھے اس سرنگ کی تہ نہیں دکھائی دی جب کہ وہ سرنگ کا دہانہ جس سے ہم اس سرنگ میں داخل ہوئے تھے رفتہ رفتہ چھوٹا ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔

ہم اس رسّی کو چودہ مرتبہ کھول کر نیچے پھینک چکے تھے اور ہر ایک ٹکڑا طے کرنے

میں آدھا گھنٹہ لگ جاتا جب کہ پندرہ منٹ ہم آرام کرتے تھے گویا اس طریقے سے ہمیں اس سرنگ میں اترتے ہوئے ساڑھے دس گھنٹے ہو چکے تھے اور دو سو فیٹ کی رسّی کے ذریعہ چودہ بار اترنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اب تک اٹھائیس سو فیٹ کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔

اس موقع پر ہانس نے اونچی آواز سے کہا۔ "ٹھہرو۔"

اس سے پہلے کہ میرے پاؤں چچا کے سر سے ٹکرا جاتے میں رک گیا۔

"ہم پہنچ گئے۔" پروفیسر نے کہا۔

"کہاں؟" میں نے پھسل کر ان کے برابر پہنچتے ہوئے پوچھا۔

"سرنگ کی تہ میں۔"

"کیا یہاں سے کوئی دوسرا راستہ نہیں جاتا؟"

"میں نے ایک نشیبی راستہ دائیں جانب سے نکلتے دیکھا ہے" "مگر ہم اسے کل دیکھیں گے۔ اس وقت کچھ کھا کر آرام کیا جائے" انھوں نے کہا۔

اس وقت تک مکمل تاریکی نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے کھانا کھایا اور پھر چٹانوں اور لاوے کے بستر پر لیٹ گئے۔ سرنگ کے بالکل اوپر جیسے کسی دیو پیکر خردبین کے ذریعے مجھے ایک چمک دار ستارہ دکھائی دیا۔ پھر میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور میں گہری نیند سو گیا۔

# دس ہزار فٹ نیچے

صبح آٹھ بجے سورج کی کرن پڑنے سے ہم سب بیدار ہو گئے' سورج کی وہ کرن لاوے کی چٹانوں سے منعکس ہو کر نیچے تک پھیلی ہوئی آ رہی تھی۔

"البرٹ کیا تم کنگس اسٹریٹ والے ہمارے چھوٹے سے مکان میں کبھی اتنے پُر سکون انداز سے سوئے ہو؟ یہاں شہر کا شور غل بھی نہیں ہے۔" چچا نے کہا۔

"شور اس لیے نہیں ہے کہ ہم بہت نیچے آ چکے ہیں، مگر یہاں ڈر بھی لگ رہا ہے۔"

"اگر تم ابھی سے اتنے خوف زدہ ہو تو بعد میں تمھارا کیا حال ہو گا؟" چچا جان چیخے۔

"یہاں صرف انتیس انچ کا دباؤ ہے۔ یہ سرنگ سطح سمندر تک ہی پہنچتی ہے ابھی اس سے نیچے ہم گئے ہی نہیں ہیں۔ ہاں اب یہ بتاؤ کہ وہ بنڈل کہاں ہے جو ہانس نے نیچے پھینکا تھا؟"

وہ "رہا۔" ہانس نے اشارہ کر کے بتایا۔ بنڈل تقریباً سو فیٹ اوپر ایک چٹان میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ بلّی کی طرح وہاں گیا اور جا کر اسے اٹھا لایا۔

"ٹھیک ہے۔" چچا نے کہا۔ "آؤ اب ناشتہ کریں، مگر یہ یاد رکھنا ہے کہ ابھی ہمیں ایک طویل سفر کرنا ہے۔"

ہمارے ناشتے میں بسکٹ اور گوشت کے ٹکڑے تھے، لیکن صرف چند نوالے جنھیں ہم نے پانی کے ساتھ حلق سے اتار لیا۔ پھر میرے چچا نے اپنی جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور ایک کے بعد دوسرے آلے کو دیکھ کر معلومات درج کرنا شروع کر دیں۔

۲۹/جون بروز پیر

وقت: صبح آٹھ بج کر ۱۷ منٹ

دباؤ: ۲۹ انچ

درجہ حرارت: ۶ درجہ سینٹی گریڈ

سمت: مشرق۔ جنوب، مشرق

چچا جان نے گذشتہ رات جن اندھیری سرنگوں کی طرف اشارہ کیا تھا اور جن کا حوالہ دیا تھا قطب نما بھی وہی سمت بتائی تھی۔

"اور اب البرٹ!" پروفیسر نے خوش ہو کر کہا "ہم واقعی نیچے اتریں گے۔ حقیقت میں یہ ٹھیک وہ وقت ہے جب یہاں سے ہمارا سفر شروع ہوتا ہے۔"

یہ کہنے کے بعد اس نے دو بیٹریوں والے لیمپ روشن کیے اور ان میں سے ایک ہانس

کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب ہمیں راستہ صاف دکھائے دے رہا تھا اور ہم اس قابل ہو گئے تھے کہ دیر تک سفر کر سکیں۔

"آگے بڑھو۔" چچا نے اونچی آواز میں کہا۔

ہم میں سے ہر ایک نے اپنا اپنا تھیلا اٹھایا ہوا تھا۔ میرے چچا کپڑوں اور رسیوں کے تھیلوں کو ڈھکیلتے ہوئے ہانس کے پیچھے سُرنگ میں داخل ہو گئے۔ میں نے سر اٹھا کر آخری بار سُرنگ کے بالائی حصّے کی طرف دیکھا جہاں سے آئس لینڈ کا آسمان نظر آ رہا تھا' مجھے معلوم تھا کہ اب میں اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔

سُرنگ میں پینتالیس درجے کی ڈھلان تھی۔ ۱۲۲۹ء میں یہ آتش فشاں آخری بار پھٹا تھا اور اس نے لاوا اگلا تھا۔ اب اس لاوے نے خشک ہو کر زینوں کی شکل اختیار کر لی تھی جس پر قدم رکھتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس لاوے سے ہمارے بجلی کے لیمپوں کی روشنی بھی منعکس ہو رہی تھی' سُرنگ کی چھت اور دیواروں پر اس روشنی سے عجیب و غریب رنگین شکلیں بن رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ خوبصورت جگمگاہٹ ہمارا استقبال کر رہی ہے۔

"کس قدر حیرت انگیز منظر ہے۔" میں نے کہا "چچا جان دیکھیے تو سہی۔ کیا آپ لاوے سے پھوٹنے والے رنگوں اور سرنگ کی چھت پر بننے والی شکلوں کی تعریف نہیں کریں گے؟"

"البرٹ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس جگہ کو پسند کرنا شروع کر دیا ہے۔ آگے جا کر تمھیں اس سے بھی خوب صورت مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ چلو آگے بڑھو۔"

چلنے کی بجائے اسے پھسلنا کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس لیے کہ ہم اس ڈھلان پر مسلسل پھسل رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں قطب نما تھا اور نگاہ اس پر جمی ہوئی تھی' اس کی سوئی مسلسل جنوب مشرق کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

سُرنگ میں بڑھنے پر یہ اطمینان ہوا کہ اس کا درجہ حرارت نہیں بڑھ رہا تھا۔ میں

تھرمومیٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمیں سرنگ میں داخل ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے مگر درجہ حرارت ۱۰ سینٹی گریڈ تک ہی پہنچا تھا۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ہماری سفر عمودی کی بجائے افقی ہے یعنی ہم نیچے جانے کے بجائے سیدھے چل رہے ہیں۔ بہرحال حقیقت تو پروفیسر ہی کو معلوم ہوگی اس لیے کہ وہ آلوں سے تمام چیزوں کی پیمائش کر رہے تھے۔

شام کو تقریباً آٹھ بجے انھوں نے ہمیں رُکنے کا حکم دیا۔ ٹھہرنے کا یہ حکم میرے کانوں کے لیے موسیقی کا درجہ رکھتا تھا' اس لیے کہ سات گھنٹوں سے ہم مسلسل چل رہے تھے اور ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رُکے تھے۔ ہانس نے لاوے کے ایک بلاک پر کھانا سجایا تو ہم سب نے رغبت سے کھالیا۔

ہم اس وقت ایسی جگہ تھے جسے ایک قسم کا غار کہا جاسکتا ہے جہاں ہوا کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا' مگر ایک خیال مجھے پریشان کر رہا تھا کہ ہم پانی کہاں سے حاصل کریں گے۔ چچا کو یہ توقع تھی کہ ہمیں زیرِ زمین چشمہ مل جائے گا لیکن ابھی تک ایسا کوئی چشمہ نہیں ملا تھا!

"ہمارے پاس پانی کا جو ذخیرہ ہے وہ صرف پانچ روز تک چل سکے گا۔" میں نے انھیں بتایا۔

"البرٹ اس کی پروانہ کرو۔ جب ہم اس لاوے کی جگہ سے گزر جائیں گے تو ہمیں اپنی ضرورت سے زیادہ پانی مل جائے گا۔"

"مگر لاوا تو بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ ابھی زیادہ نیچے تک نہیں پہنچے ہیں۔"

"تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟"

"اگر ہم افقی سمت میں بڑھنے کے ساتھ گہرائی میں بھی جاتے تو گرمی کا احساس ہوتا۔"

"یہ محض تمھارا خیال ہے۔" چچا نے جواب دیا "یہ دیکھو کہ تھرمومیٹر کیا کہتا ہے؟"

"پندرہ درجے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم جب سے سرنگ میں داخل ہوئے ہیں

حرارت صرف ۹ درجے بڑھی ہے۔"

"زیر زمین حرارت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہر ایک سو پچیس فٹ کے بعد ایک درجہ بڑھ جاتا ہے۔ اس سے حساب لگا لینا چاہیے۔"

"ہاں میرے بچے حساب لگاؤ۔" چچا جان بولے۔

"ایک منٹ ٹھہریے" میں نے کہا اور اپنی نوٹ بک میں چند اعداد و شمار لکھے "ایک سو پچیس کو اگر نو سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب گیارہ سو پچیس ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم گیارہ سو پچیس فیٹ نیچے پہنچ چکے ہیں۔"

"جب کہ میں نے یہ تجزیہ کیا ہے کہ ہم سطح سمندر سے دس ہزار فیٹ نیچے جا چکے ہیں۔"

"ناممکن!" میں نے بے اختیار کہا۔

"سو فیصد ممکن ہے' ورنہ پھر اعداد و شمار مذاق بن کر رہ جائیں گے۔" انھوں نے کہا۔ ان کا حساب درست تھا۔ ہم دنیا کی گہری ترین سرنگ کے مقابلے میں چھے ہزار فیٹ نیچے جا چکے تھے۔ اس طرح سے ہمیں اسی درجے سینٹی گریڈ کا سامنا کرنا چاہیے تھا' مگر درجہ حرارت پندرہ تھا جو حیرت کی بات تھی!

دوسرے روز ۳۰ر جون کو صبح چھے بجے ہم نے پھر لاوے کی سرنگ میں سفر شروع کیا۔ اب ڈھلان کسی قدر کم تھی۔ بارہ بج کر سترہ منٹ پر ہانس ٹھہر گیا۔

"آہ!" میرے چچا نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "اب ہمیں ایک فیصلہ کرنا پڑے گا۔"

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ سرنگ آگے جا کر دو راستوں میں تقسیم ہو گئی ہے اور دونوں راستے یکساں طور پر تنگ اور تاریک ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

چچا ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہچکچائے اور انھوں نے مشرقی راستے کی طرف اشارہ کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم تینوں اس میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں ڈھلان قدرے کم ہو گئی

تھی۔ بعض اوقات سرنگ کشادہ ہو جاتی اور ہمیں ایسی اونچی اونچی محرابیں دکھائی دینے لگتیں جیسی کہ چرچ میں ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں وہ اتنی نیچی ہو جاتی کہ ہمیں جھکنا پڑتا یا پھر تقریباً رینگنا پڑتا۔

موسم اب تک خوش گوار اور آرام دہ تھا' مگر جب لاوا اس سرنگ سے نکل رہا ہو گا تو یہاں کا درجہ حرارت کس قدر بڑھ گیا ہو گا؟"

"مجھے امید ہے کہ جب تک ہم لوگ اس سرنگ میں ہیں اس آتش فشاں کو نہیں پھٹنا چاہیے۔" میں نے سوچا۔ میں نے اپنے خیالات سے چچا بروک کو آگاہ نہیں کیا۔ اس لیے کہ وہ میرے خوف اور اندیشوں کو محسوس نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دماغ میں یہ خیال بسا ہوا تھا کہ انھیں آگے بڑھنا چاہیے۔

شام کے چھے بجے تک جب کہ دن روشن اور صاف تھا ہم نے جنوب کی طرف تقریباً پانچ میل سفر طے کیا' مگر ہم مشکل ہی سے چوتھائی میل نشیب میں گئے ہوں گے۔ چچا نے ہدایت کی کہ ہم ٹھہر جائیں۔ کھانے کے دوران ہم نے زیادہ گفتگو نہیں کی اور دماغ پر کوئی بوجھ رکھے بغیر سو گئے۔ رات کو سونے کے لیے ہمارا انتظام بہت سادہ تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک کمبل تھا' جسے ہم اپنے چاروں طرف لپیٹ لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ہمیں سردی نہیں لگتی تھی اور کسی چیز سے خوف بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔

دوسرے روز ہم جب بیدار ہوئے تو ہم نے خود کو تازہ دم اور ہشاش بشاش محسوس کیا' اس کے بعد ہم نے اپنا سفر پھر شروع کر دیا۔ وہ راستہ جس میں ہم لوگ سفر کر رہے تھے اب بالکل عمودی ہوتا جا رہا تھا' مگر دس بجے کے قریب چڑھائی شروع ہو گئی اس لیے ہمارے سفر کرنے کی رفتار سست پڑ گئی۔

"کیا بات ہے البرٹ؟" پروفیسر نے فکر مندی سے پوچھا۔

"میں تھک گیا ہوں۔"

"کیا؟" "ہم نشیب میں جا رہے ہیں تو تم تھکن محسوس کر رہے ہو؟"

"معاف کیجیے گا چچا جان آپ کا مطلب ہے کہ ہم اوپر جا رہے ہیں۔ ڈھلان طے کر کے ہم آدھا گھنٹہ پہلے چڑھائی پر آ چکے ہیں۔ اگر ہمارا سفر یونہی جاری رہا تو ہم پھر سطح پر پہنچ جائیں گے۔"

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا جیسے وہ کوئی بات سننا نہ چاہتے ہوں۔ میں مزید کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن انھوں نے اشارہ کیا کہ میں چلتا رہوں۔ میں تیز قدمی سے ہانس کے پیچھے چلنے لگا جو چچا کے پیچھے تھا۔ ان لوگوں سے بچھڑنا میرے لیے عذاب ہوتا۔

دوپہر کے وقت اس راستے کی دیواریں تبدیل ہونا شروع ہو گئیں۔ لاوے کی جگہ ٹھوس پرت دار چٹانیں آ گئیں۔ اب گرینائٹ ختم ہو رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہم غلط راستے پر جا رہے ہیں۔

"یہ دیکھیے!" میں نے چچا کو اس طرف توجہ دلائی کہ یہاں مختلف انداز کی چٹانیں ہیں۔

"ہوں کیا بات ہے؟"

"ہم اس زمانے کی چٹانوں میں پہنچ چکے ہیں جب جانوروں اور پودوں نے جنم لیا تھا۔"

میرا خیال تھا کہ پروفیسر اپنے لیمپ سے دیواروں کا مشاہدہ کریں گے اور پھر حیران ہوں گے، مگر انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور مسلسل چلتے رہے۔

کیا وہ میری بات سمجھ چکے تھے؟ اور وہ اس بات سے انکار کر رہے تھے کہ ہم راستہ نہیں بھولے ہیں؟ یہ واضح تھا کہ ہم نے لاوے والا راستہ چھوڑ دیا ہے اور یہ نیا راستہ ہمیں سینی فلز کے لاوا اگلنے والے منبع تک نہیں لے جا سکتا مگر یہ بھی ممکن تھا کہ میرا اندازہ غلط ثابت ہوتا۔

میں نے سوچا اگر میں درست ہوں تو جلد ہی پرانے درختوں کے نمونے چٹانوں پر ملیں گے اس لیے مجھے اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔

تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے وہ ثبوت مل گئے جس کی مجھے تلاش

تھی۔ ہم اب ادوے پر نہیں چل رہے تھے بلکہ ایسی مٹی پر چل رہے تھے جس میں پودوں اور جانوروں کے ڈھانچے شامل تھے۔ پروفیسر بروک نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا ہوگا مگر وہ کچھ نہیں بولے اور خاموش رہے۔

میں اس صورتِ حال کو برداشت نہ کر سکا۔ میں نے ایک جانور کا مکمل ڈھانچہ اٹھایا اور بھاگ کر چچا کے پاس گیا اور انھیں دکھانے لگا۔ "یہ دیکھیے۔" میں نے کہا۔

"ہاں البرٹ یہ کسی جانور کا ڈھانچہ ہے۔ ہم گرینائٹ اور لاوا کے راستے سے دوسرے راستے پر آچکے ہیں ممکن ہے مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو، مگر جب تک ہم اس سرنگ کے آخری حصے میں نہیں پہنچ جائیں گے اس وقت تک مجھے یقین نہیں آئے گا۔"

"میں سمجھ گیا چچا جان کہ ہمیں سفر جاری رکھنا چاہیے تاوقتیکہ ہمیں کسی پریشانی کا سامانہ کرنا پڑے۔" میں نے کہا۔

"کیسی پریشانی؟"

"پانی کی کمی۔"

"البرٹ، ایسی صورت میں ہمیں پانی کم پینا چاہیے۔" وہ بولے۔

## پانی کی تلاش

ہمارے لیے پانی کم استعمال کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس شام کھانے کے وقت میں نے محسوس کیا کہ ہمارا پانی تین روز سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ دوسرے روز ہم ایک دوسرے سے گفتگو کیے بغیر چلتے رہے۔ روشنی پڑنے پر چٹانیں چمکنے لگتی تھیں اس لیے کہ وہ رنگین سنگ مرمر کی چٹانیں تھیں۔ اس روز مجھے چٹانوں پر گذشتہ روز کے مقابلے میں جدید دور کے جانوروں کے نقوش نظر آئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم جانوروں کی زندگی

کا زینہ عہد بہ عہد چڑھ رہے تھے۔

پروفیسر بردک کو کوئی پروا نہیں تھی۔ انھیں دو باتوں میں سے ایک کی توقع تھی۔ ایک یہ کہ ان کے قدموں کے پاس کوئی راستہ مل جائے جس سے ہم نشیب میں اترنا شروع کر دیں یا پھر یہ کہ ہمارا راستہ ختم ہو جائے۔ شام ہو گئی لیکن ان کی دونوں توقعات پوری نہیں ہوئیں۔

اس رات مجھے پیاس لگنا شروع ہوئی۔

جمعہ کو ہم نے پھر اپنا سفر شروع کیا۔ دس گھنٹے تک سفر کرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ سنگ مرمر اور دوسری چٹانیں غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ کوئلے کی چٹانیں شروع ہو گئیں۔

"یہ کوئلے کی کان ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں اور یہ ایسی کان ہے جس میں کوئی کان کن نہیں ہے۔"

"اوہ! کون کہہ سکتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس سُرنگ کو آدمیوں نے نہیں بنایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے اس لیے کھانا کھا لیا جائے۔"

ہانس نے کھانا تیار کیا۔ میں نے مشکل ہی سے کوئی چیز کھائی، مگر پانی اتنے قطرے ہی پیے جتنی اجازت ملی تھی۔ سیاحوں کی مخصوص بوتل میں نصف مقدار میں پانی رہ گیا تھا اور یہ مقدار تین آدمیوں کے لیے تھی!

میرے دو ساتھیوں نے کمبل اپنے جسم کے گرد لپیٹا اور سو گئے، مگر مجھے نیند نہیں آسکی اور میں صبح تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ہفتے کی صبح ہم نے پھر سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ بیس منٹ بعد ہم ایک غار کے قریب پہنچ گئے جو اتنا بڑا تھا کہ مجھے احساس ہو گیا کہ اس سرنگ کو آدمیوں نے نہیں کھودا ہو گا اور ہم اس میں داخل ہونے والے پہلے خوش نصیب ہیں۔

کوئلے کی اس کان میں ہم شام تک سفر کرتے رہے۔ میرے چچا بے چین ہو رہے تھے۔ ہمیں بیس فیٹ سے زیادہ فاصلے کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی اس لیے سرنگ

کی لمبائی کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

تقریباً چھے بجے اچانک ایک دیوار ہم لوگوں کے سامنے آگئی۔ دائیں بائیں یا اوپر نیچے کہیں کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم آخر پہنچ چکے تھے۔

"بہت خوب!" چچا چلّائے۔ "اب یہ معلوم ہو گیا کہ ہم اس راستے پر نہیں ہیں جو آرنی نے اختیار کیا تھا۔ ہم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ مڑ کر واپس چلنا شروع کر دیں۔ رات کو آرام کیا جائے۔ تین روز بعد ہم اس مقام تک پہنچ جائیں گے جہاں راستہ دو حصّوں میں تقسیم ہوا تھا۔"

"ہاں اگر ہم میں اتنی سکت ہوئی۔ اس لیے کہ کل ہمارا پانی کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"تو کیا اس کے ساتھ ہی ہماری ہمت بھی ختم ہو جائے گی؟" پروفیسر نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

انھیں جواب دینے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔

ہفتے کی صبح ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا اور دن ختم ہونے تک ہمارا پینے کا پانی ختم ہو گیا۔ اب ہمارے پاس جن (ایک قسم کی شراب) کے علاوہ کوئی چیز پینے کو نہیں تھی مگر اس کی طرف دیکھنا بھی مجھے گوارا نہیں تھا اس لیے کہ جن کا گھونٹ لیتے ہی حلق میں آگ لگتی محسوس ہوتی تھی۔ میں بہت تھک چکا تھا۔ کئی بار تو میں بے ہوش ہو گیا۔ میری وجہ سے دوسرے ٹھہر جاتے اور مجھے سہارا دینے لگتے۔ چچا کی حالت بھی خراب تھی وہ پیاس اور تھکان کا شکار تھے۔

۷ر جولائی منگل دس بجے صبح اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں پر چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے ہم بالآخر اس مقام تک پہنچ گئے جہاں سے کہ سرنگ دو حصوں میں تقسیم ہوتی تھی۔ میں بے دم ہو کر زمین پر گر گیا۔ چچا اور ہانس لاوے کی چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور بسکٹ

کھانے لگے۔ مجھ پر کمزوری چھا رہی تھی اس لیے میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور میں سو گیا۔ چچا تھوڑی دیر بعد میرے قریب آئے اور انھوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔

"اٹھو بچے!" انھوں نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

مجھے سخت گیر پروفیسر سے اتنی شفقت کی توقع نہیں تھی۔ میں نے ان کا کانپتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ انھوں نے آنسوؤں سے ڈبڈباتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا' پھر اپنی پانی کی بوتل میرے ہونٹوں سے لگا دی۔

"لو پیو۔" انھوں نے کہا۔

میں ٹھیک سے سن رہا تھا؟ یا میرے چچا دیوانے ہو گئے تھے؟"

"پیو۔" انھوں نے دوبارہ کہا تو میں نے پانی پی لیا۔

اس ایک پانی کے گھونٹ میں کتنی مٹھاس اور حلاوت تھی میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ کہنے کو صرف ایک گھونٹ تھا مگر اس نے میری زندگی بچا لی۔

"بس یہی ایک گھونٹ تھا' سمجھے؟ میں نے اسے ہوشیاری سے تمھارے لیے بچا لیا تھا البرٹ۔"

"پیارے چچا۔" میں نے سرگوشی میں کہا' میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر چچا اب جب کہ ہمارا پانی کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے ہمیں سینی فلز واپس چلے جانا چاہیے۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ مجھے اتنی طاقت دے دے کہ میں اس کی چوٹی تک دوبارہ چڑھ سکوں۔"

"واپس چلیں!" چچا نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں واپس چلیں۔ جلدی سے۔"

ہمارے درمیان کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔

"البرٹ!" چچا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں نے جو پانی تمھیں دیا ہے کیا اس

سے تمھاری توانی اور طاقت بحال نہیں ہوئی؟" انھوں نے پوچھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کیسے آدمی ہیں۔

"کیا آپ واپس نہیں جانا چاہتے؟"

"میں اپنی اس مہم کو چھوڑ دوں جب کہ یہ کامیاب ہونے والی ہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ بولے۔

"پھر ہمیں مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔"

"نہیں البرٹ نہیں۔ تم ضرور واپس جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مر جاؤ۔ ہانس تمھارے ساتھ واپس جائے گا۔ مجھے تم لوگ یہیں چھوڑ دو۔"

"یہیں چھوڑ دیں؟"

"ہاں یہیں چھوڑ دو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ جب میں نے سفر شروع کر دیا ہے تو میں اسے ضرور ختم کروں گا یا پھر کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔ جاؤ البرٹ جاؤ۔"

ہمارے گائڈ ہانس نے اس صورت حال کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ یقیناً اس نے بات سمجھ لی ہو گی کہ میں اور چچا کس موضوع پر بات کر رہے ہیں اور کن خطرات کی طرف ہمارا اشارہ ہے مگر وہ اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا حالانکہ اس سے اس کی زندگی کو بھی خطرہ تھا، مگر وہ اپنے مالک کی خواہش کے مطابق ٹھہرنا اور چلنا چاہتا تھا۔ میں اسے کیسے سمجھاتا کہ ہم سب کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ ہم مل کر چچا سے کہہ سکتے تھے اور انھیں سینی فلز کے دہانے پر واپس چلنے پر مجبور کر سکتے تھے اور ضرورت پڑنے پر ان پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔

میں ہانس کے پاس گیا اور میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا، لیکن اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں لیکن اس نے چچا کی طرف اشارہ کیا اور کہا "مالک!"

"مالک!" میں نے چیخ کر کہا۔ "تم پاگل ہو گئے۔ وہ تمھاری جان کے مالک نہیں ہیں۔

ہمیں واپس جانا چاہیے اور انھیں بھی ساتھ لے جانا چاہیے۔ تم سن رہے ہو نا؟" میری بات سمجھ رہے ہو؟"

میں نے ہانس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اسے اپنی جگہ سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چچا نے دخل دیا "البرٹ خود کو ہلکان مت کرو۔ ہانس ایک فرماں بردار ملازم ہے اور یہ وہی کچھ کرے گا جو اس سے کہا جائے گا۔ لہٰذا میری بات غور سے سنو۔"

میں نے اپنے ہاتھ باندھ لیے اور چچا کی طرف دیکھا۔

"اس وقت ہمارا مسئلہ پانی کی کمی ہے۔" انھوں نے کہا۔ "مشرقی راستے پر ہمیں لاوا اور کوئلہ ملا مگر بدقسمتی سے پانی نہیں ملا۔ لیکن ہو سکتا ہے مغربی راستے پر قسمت ہمارا ساتھ دے اور ہمیں پانی مل جائے۔"

میں نے اپنا سر نفی میں ہلایا جیسے مجھے ان کی باتوں پر اعتبار نہیں آ رہا ہو۔

"ٹھہرو! مجھے اپنی بات ختم کرنے دو۔ انھوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب تم یہاں پڑے سو رہے تھے تو میں نے مغربی راستے پر جا کر دیکھا تھا۔ وہ سیدھا نیچے جاتا ہے۔ چند گھنٹوں بعد ہم گرینائٹ کی چٹانوں کے قریب پہنچ جائیں گے جہاں مجھے یقین ہے کہ بہت سے چشمے ملیں گے اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی صرف ایک روز کا انتظار اور کر لو۔ اگر ایک روز تک کوئی چشمہ نہ ملا اور ہم پانی حاصل نہ کر سکے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہاں سے تم لوگوں کے ساتھ واپس سینی فلز کی چوٹی تک چلوں گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انھوں نے ایسا وعدہ کیسے کر لیا؟ بہر حال میں نے زیادہ بحث نہیں کی "ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "آپ کی جو سمجھ میں آئے کیجیے۔ اللہ آپ کو یہ مہم جاری رکھنے کے لیے طاقت اور حوصلہ عطا کرے۔ دن ختم ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔ آیئے چلیں۔"

ہم نے سرنگ کے مغربی حصہ میں اترنا شروع کر دیا۔ معمول کے مطابق ہانس سب سے آگے گیا۔ ہم نے تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کر لیا ہو گا کہ پروفیسر نے اپنے لیمپ سے

سرنگ کی چٹانوں کو دیکھا اور چیختے ہوئے بولے۔ ”یہ تہ دار چٹانیں ہیں۔ اب ہم بالکل صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ تیزی سے آگے بڑھو۔“

ہم جس ٹیڑھے میڑھے اور بل کھائے ہوئے راستے پر چل رہے تھے اس نے یقیناً اس وقت ایسی عجیب و غریب شکل اختیار کی ہو گی جب دنیا وجود میں آئی ہو گی اور اس نے سکڑنا، سمٹنا شروع کیا ہو گا، اس کی وجہ سے اس درز میں دراڑیں اور گڑھے پیدا ہو گئے۔

ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے جا رہے تھے ہمیں تہ دار چٹانیں زیادہ تعداد میں مل رہی تھیں۔ میں نے سوچا ایک ماہر ارضیات کے لیے ان چٹانوں کا مشاہدہ کرنا یقیناً ایک دلچسپ بات ہو گی۔ کاش کہ کوئی یہاں آئے اور انھیں چھو کر دیکھے۔

ان چٹانوں کی پرتوں میں کہیں کہیں سبز رنگ کے لہریے دکھائی دیتے تھے جو یقیناً تانبے جیسی قیمتی دھات تھی! لالچی انسانوں کی نظروں سے دور بڑی معدنی دولت یہاں چھپی ہوئی تھی۔ آگے جا کر ہمیں سفید دھات مائیکا دکھائی دی۔ ہمارے لیمپوں کی روشنی اس سے منعکس ہو کر اس طرح سے آ رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی ہیرے میں سے گزر رہے ہیں۔

شام چھے بجے کے قریب روشنی کا یہ جشن ختم ہو گیا اور دیواروں سے تاریکی جھلکنے لگی۔ وہاں مائیکا کے ساتھ دوسری دھاتیں ملی ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ گرینائٹ ہے، وہی گرینائٹ جس نے پوری دنیا کا بوجھ سنبھال رکھا ہے۔ اس وقت ہم گرینائٹ کے ایک بڑے قید خانے میں تھے۔

آٹھ بج چکے تھے اور ابھی تک پانی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے میرا حلق سوکھ رہا تھا اور کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ مگر چچا جان آگے ہی آگے چلے جا رہے تھے اور ان کے کان کسی چشمے کی آواز سننے کے لیے بے تاب تھے۔ میری طاقت اور توانائی جواب دیتی جا رہی تھی، میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ مگر میں چچا کا ساتھ دے رہا تھا،

اور رُکنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ دن بھی تیزی سے ختم ہو رہا تھا' اور یہ آخری دن تھا۔ انھیں اس میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا تھا۔

لیکن میں زیادہ دیر تک ان کا ساتھ نہیں دے سکا اور کراہتا ہوا گر گیا۔ "میری مدد کیجیے۔ میں مر رہا ہوں۔"

چچا میری طرف مڑے اور انھوں نے میری حالت دیکھ کر کہا "اوہ اب تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔"

بیہوش ہونے سے پہلے میں نے دیکھا ان کے چہرے پر میرے لیے دُکھ تھا۔ وہ افسردہ تھے۔

جب مجھے دوبارہ ہوش آیا اور میری آنکھیں کھلیں تو میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کمبل میں لپٹا دیکھا۔ کیا وہ سو رہے تھے؟ میں تھکن کی وجہ سے سو نہ سکا۔ مجھے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ میں زمین کی سطح تک کیسے واپس جاؤں گا؟

ہم زمین کی سطح سے چار میل نیچے پہنچ چکے تھے اور ہمارے سروں پر ہزاروں ٹن مٹی تھی' اور اس کا بوجھ میں اپنے شانوں پر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا تو ایسا لگا جیسے میرا جسم ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہو۔ میں جنبش نہیں کر سکتا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش ترک کر دی۔

چند گھنٹے یونہی گزر گئے۔ موت کا سکوت طاری رہا۔ ان موٹی چٹانوں کے دوسری طرف سے کوئی آواز ہم تک پہنچ بھی نہیں سکتی تھی!

اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی آواز سنی تھی۔ راستے کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ہانس کو لیمپ ہاتھ میں لے کر جاتے دیکھا تھا۔

وہ ہمیں چھوڑ کر کیوں جا رہا تھا؟ کیا وہ ہمیں دھوکا دے رہا تھا۔ چچا جان سو رہے تھے۔ میں نے آواز دے کر انھیں آگاہ کرنا چاہا لیکن حلق سے آواز نہیں نکلی۔ سناٹا اور تاریکی پہلے

سے زیادہ گہری ہوتی جارہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس تاریکی میں اپنا ہاتھ دیکھنا بھی ممکن نہ رہا۔

"ہانس نے ہمیں چھوڑ دیا ہے۔" میں نے خود سے کہا۔ "ہانس' ہانس"

تھوڑی دیر بعد مجھے اپنے پہلے خیال پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ ہانس جیسے پُرخلوص شخص کے بارے میں میں نے ایسا کیوں سوچا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ واپس جانے کے بجائے آگے جارہا ہو؟ اس نے کوئی بات دریافت کرلی ہو؟ اس سناٹے میں اس نے کوئی ایسی آواز سن لی ہو جو میں نے بھی نہیں سنی ہو؟"

# پانی مل گیا

میں ایک گھنٹے تک یہ سوچتا رہا کہ ہانس ہمیں چھوڑ کر کیوں گیا ہے؟ پھر میرے دماغ میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔

بالآخر میں نے قدموں کی آواز سنی۔ ہانس واپس آرہا تھا۔ نزدیکی دیوار پر روشنی کی چمک دکھائی دی پھر سُرنگ کے موڑ پر روشنی چمکی اور اس کے بعد ہانس دکھائی دیا۔ وہ میرے چچا کے پاس گیا۔ اس نے ان کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا اور جگا دیا۔ "کیا بات ہے؟ چچا نے پوچھا۔

"پانی۔" ہانس نے کہا۔

"پانی! پانی۔" میں چلّایا' پھر میں نے پاگلوں کی طرح سے تالیاں بجائیں اور اپنے بازو لہرائے۔

"پانی!" میرے چچا نے دہرایا۔ "کہاں؟"

"نیچے بہت نیچے۔"

میں نے نزدیک جاکر ہانس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے میری طرف اُچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ پھر ہم نے تیزی سے اپنا سامان اٹھایا اور ڈھلان کی طرف چل پڑے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم

نے سوا میل کا فاصلہ طے کیا اور تقریباً دو ہزار فیٹ نیچے چلے گئے' مگر پانی کا کوئی چشمہ نہیں ملا' جس سے میں ایک بار پھر خوف زدہ ہو گیا' مگر کچھ ہی دیر بعد میں نے گرینائٹ کی دیواروں کی دوسری طرف سے آسمانی بجلی کی سی گرج سنی۔

"ہانس نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔" چچا نے کہا "یہ گرج دراصل کسی دریا کی آواز ہے۔"

"دریا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہمارے بہت قریب کوئی زیر زمین دریا بہہ رہا ہے۔"

ہم پانی کی آس لگائے تیزی سے آگے بڑھے۔ اس وقت مجھے تھکن کا ذرا احساس نہیں تھا۔ پانی کے بہنے کی آواز نے مجھے تر و تازہ کر دیا تھا۔ دریا جو کبھی ہمارے سروں پر تھا اب ہمارے بائیں جانب چٹانوں کے پیچھے بہہ رہا تھا۔ میں نے چٹان پر ہاتھ لگایا کہ شاید وہ نم ہو مگر وہاں نمی نہیں تھی۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ ہم نے سوا میل کا فاصلہ مزید طے کر لیا۔

میں نے جان لیا کہ ہانس اپنی غیر حاضری کے دوران اس سے آگے نہیں گیا ہے۔ اس نے چٹانوں کے پیچھے بہنے والے پانی کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا' مگر نہ تو اس نے پانی کو دیکھا اور نہ ہی پیا تھا۔

ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ پانی کے شور مچانے کی آواز مدّہم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر ہم مزید آگے گئے تو پھر یہ آواز پیچھے رہ جائے گی۔ ہم پھر مڑے۔ ہانس اس مقام پر ٹھہر گیا جہاں دریا بہت قریب معلوم ہو رہا تھا۔ میں چٹان کے قریب بیٹھ گیا۔ مجھے دو فٹ قریب سے گزرتے ہوئے پانی کی آواز سنائی دے رہی تھی' لیکن ایک دیوار نے اسے مجھ سے دور کر رکھا تھا۔

میں نے مایوسی سے ایک گہرا سانس لیا' کیونکہ پانی تک پہنچنے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہانس نے میری طرف دیکھا' میرا خیال ہے کہ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا لیمپ اٹھا کر جائزہ لیا۔ دیوار کے قریب جا کر اپنا کان لگایا۔ چند قدم آگے اور

پیچھے گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ پانی کی آواز کہاں سے بہت تیز آ رہی ہے۔ وہ مقام زمین کی سطح سے تین فیٹ بلند تھا۔ مجھ پر ہیجان طاری تھا اور یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

پھر جب اس نے اپنی کدال اٹھائی تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔

"اب ہم بچ جائیں گے۔" میں نے چلّا کر کہا۔

"ہاں۔" میرے چچا نے تائید کی۔ "ہانس کا خیال درست ہے۔ یہ کتنا اچھا ملازم ہے"

مگر اس وقت کدال کو استعمال کرنا بہت خطرناک تھا۔ اس چٹان پر تو دنیا تھمی ہوئی تھی۔ اگر وہ چٹان گر جاتی تو ہم لازماً اس کے نیچے دب جاتے۔ پھر پانی پوری طاقت سے اس چٹان کے پیچھے سے نکل آتا تو ہم سب بہہ جاتے۔ ہمارے سامنے یہ سب خطرات تھے' لیکن اس وقت ہم اتنے پیاسے تھے کہ ہم نے کسی خطرے کی پروا نہیں کی۔

چچا اور مجھے اتنی جلدی تھی کہ ہم فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ چٹان پر کہاں چوٹ مارنا چاہیے' لیکن ہانس پُر سکون تھا اور خود پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ اس نے چٹان پر ایک جگہ چوٹ ماری تو وہاں چھے انچ کے قریب سوراخ ہو گیا۔ میں نے تصور کیا کہ پانی میرے ہونٹوں کو تر کر رہا ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ سوراخ مزید گہرا ہو گیا اور کدال گرینائٹ کی چٹان میں دو فیٹ اندر تک جانے لگی۔ میں بے چینی سے بل کھا رہا تھا جب کہ میرے چچا نے اپنی کدال اٹھالی اور وہ بھی کھدائی میں حصہ لینے والے تھے کہ اچانک اس سوراخ سے پانی کسی فوّارے کی طرح نکل آیا۔

ہانس کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ گر گیا۔ اس کے حلق سے بے ساختہ لیک چیخ نکلی۔ میں نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا تو میں بھی چیخ اٹھا اس لیے کہ اس چشمے میں سے اُبلتا ہوا گرم پانی نکل رہا تھا۔

"یہ اُبلتا ہوا پانی ہے۔" میں نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

"یہ جلد ہی ٹھنڈا ہو جائے گا۔" میرے چچا نے کہا۔

اس تنگ سی گلی میں بھاپ بھر رہی تھی اور چٹان کے سوراخ کا منہ چوڑا ہونے سے وہ آبشار کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی پینے کے قابل ہو گیا۔ وہ پانی کتنا روح افزا اور راحتِ جاں تھا میں بتا نہیں سکتا۔ یہ پانی کیسا تھا اور کہاں سے آرہا تھا' ہمیں اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ پانی تھا' حالانکہ اب بھی گرم تھا' مگر اس نے ہمیں زندگی بخشی تھی۔ میں ایک منٹ تک بغیر سانس لیے اسے مسلسل پیتا رہا۔

"اس میں فولاد شامل ہے۔" میں نے کہا۔

"بہت خوب!" میرے چچا نے کہا۔ "یہ سفر ہمارے لیے کسی صحت افزا مقام پر چھٹی گزارنے کی طرح ہو گا جہاں خصوصیت سے لوگ صحت بخش پانی پینے جاتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ اس جگہ کا نام ہانس کے نام پر رکھ دیا جائے۔"

"میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

ہانس نے اس بات پر کسی ردِّ عمل اظہار نہیں کیا۔ اس نے تھوڑا سا پانی پیا اور پھر ایک کونے میں معمول کے مطابق خاموش بیٹھ گیا۔

"اور اب ہمیں چاہیے کہ اس پانی کو مزید نہ بہنے دیں۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہ بہنے دیں!" میرے چچا نے پوچھا۔ "میرا خیال ہے کہ اسے ہمیشہ یونہی بہنے دیا جائے۔"

"نہیں۔ اپنی بوتلیں بھرنے کے بعد ہمیں چاہیے کہ اس سوراخ کو بند کر دیں۔"

"میں سمجھا نہیں؟" چچا نے کہا۔

"کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"تم اس سوراخ کو بند کرنے کے لیے اتنے فکر مند کیوں ہو؟" وہ بولے۔

"اس لیے کہ ....." میں نے کہا۔ مگر میری سمجھ میں اس کی کوئی مناسب وجہ نہیں آئی۔

"تو پھر اسے بہتے رہنے دینا چاہیے۔ یہ نشیب کی طرف بہتا رہے گا' ہماری رہنمائی

کرتا رہے گا اور جب تک ہم سفر کرتے رہیں گے ہمیں تازہ دم رکھے گا۔"

"کتنا شاندار خیال ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "اگر ہم اس چشمے کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے تو تو ہمارا سفر ضرور کامیاب ہو گا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری طرح سے سوچنا شروع کر دیا ہے میرے بچے۔" پروفیسر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"شروع نہیں کر دیا ہے بلکہ میں پہلے سے اس انداز سے سوچ رہا ہوں۔"

"تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ ابھی ہم چند گھنٹے اور آرام کر سکتے ہیں۔" انھوں نے کہا۔

میرے ذہن سے یہ قطعی طور پر نکل گیا تھا کہ ابھی رات ہے حالانکہ کرونو میٹر اس کی یاد دہانی کرا رہا تھا۔ جلد ہی ہم آرام سے سو گئے۔

# سمندر کے نیچے

دوسرے دن ہم اس سفر کی ساری پریشانیاں بھول چکے تھے۔ پہلے مجھے حیرت ہوئی کہ پیاس کیوں نہیں لگ رہی ہے۔ پھر یاد آیا کہ میرے پیروں کے نیچے چشمہ بہہ رہا ہے۔ ہم نے ناشتہ کیا اور پھر اس زمین دوز چشمے کا صحت افزا پانی پیا۔ اس سے میری طبیعت بشاش ہو گئی۔ میرے چچا جو مضبوط ارادوں کے مالک تھے۔ آخر اس سفر میں کامیاب نہ رہتے جب کہ انھیں ہانس جیسا محنتی اور مخلص گائڈ اور مجھ سا محبت کرنے والا بھتیجا تھا۔ اگر کوئی یہ تجویز پیش کرتا کہ ہمیں سینی فلز کی چوٹی پر واپس چلنا چاہیے تو میں اس سے انکار کر دیتا۔

بہر حال ہر صورت میں ہمیں زمین کی تہہ میں اترنا تھا۔

"آیئے اپنا سفر شروع کریں۔" میں نے چلّا کر کہا۔

جمعرات ۹ر جولائی کی صبح آٹھ بجے ہم نے اپنا سفر پھر سے شروع کر دیا۔ پہاڑی

چشمے کا پانی بل کھاتا اور اِدھر اُدھر مڑتا بہتا رہا لیکن اس کا رخ جنوب مشرق ہی کی طرف رہا۔ میرے چچا قطب نما سے سمت دیکھتے رہتے تھے۔

یہاں پر ڈھلان بہت کم تھی۔ چشمہ ہمارے پہلو میں بہہ رہا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی مہربان فرشتہ ہے جو ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔ میں خوش تھا، مگر میرے چچا نہیں تھے۔ وہ اس پر بڑبڑا رہے تھے کہ راستہ افقی کیوں ہے اسے عمودی ہونا چاہیے تھا!

اس دن اور اس کے بعد دوسرے دن ہم نے ایک لمبا سفر کیا، مگر ہم گہرائی میں کم ہی گئے۔

جمعہ ۱۰ر جولائی کی شام ہم نے حساب لگایا کہ ہم رکیاوک کے جنوب مشرق میں پچھتر میل اور سات میل گہرائی میں پہنچ چکے ہیں۔

اچانک ہمیں اپنے قدموں کے نزدیک ایک خلا نظر آیا جسے دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا، مگر میرے چچا نے خوشی سے تالی بجائی۔

"اب ہم اپنا سفر تیزی سے جاری رکھ سکتے ہیں۔" وہ چلّائے۔ "کوئی پریشانی اٹھائے بغیر۔ اس چٹان میں جو کنواں سا نظر آ رہا ہے یہ نیچے اترنے کے لیے زینے کا کام دے گا۔"

ہانس نے احتیاط سے ہماری کمر کے گرد رسّی لپیٹی اور پھر ہم نے اس کنویں میں اترنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک میں اس کا عادی ہو گیا تھا لہٰذا مجھے ڈر نہیں محسوس ہوا۔

ہمارے چاروں طرف گولائی میں تہ دار چٹانیں تھیں، جن کو ہم زینوں کی طرح استعمال کر کے نیچے جا رہے تھے۔ ہر پندرہ منٹ بعد ہم کسی چٹان پر بیٹھ کر آرام کرتے اور کھانے کے دوران باتیں کرتے جب کہ پینے کے لیے چشمے کا پانی موجود تھا۔ چشمہ آگے جا کر ایک آبشار میں تبدیل ہو گیا اور اب اس میں ہماری ضرورت سے زیادہ پانی تھا۔

گیارہ اور بارہ جولائی کو بھی ہم بدستور اس کنویں کے زینے طے کر رہے تھے۔ اس طرح سے ہم مزید پانچ میل گہرائی میں چلے گئے۔ اب ہم سطح سمندر سے تیرہ میل نیچے پہنچ چکے تھے۔ تیرہ جولائی کو راستہ مزید آسان ہو گیا۔ اس وقت ہم پینتالیس درجے کی ڈھلان

پر جنوب مغرب کی طرف سفر کر رہے تھے۔ اب گرد و پیش میں کوئی جاذب نگاہ منظر نہیں رہا تھا اس لیے اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ بدھ پندرہ جولائی کو پروفیسر کے حساب کے مطابق ہم اٹھارہ میل نیچے جا چکے تھے اور سینی فلز سے ایک سو پچیس میل دور پہنچ چکے تھے۔ جب میں نے یہ بات سنی تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔

"تم کیا سوچ رہے ہو میرے بچے؟" انھوں نے کہا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ اگر آپ کا حساب درست ہے تو ہم آئس لینڈ کے نیچے پہنچنے والے ہیں۔"

"اوہ ایسی بات ہے؟"

"ہاں۔ ہم اس کو چیک کر سکتے ہیں۔"

میں نے نقشا دیکھا اور چند پیمائشیں کیں۔

"میں صحیح کہہ رہا تھا۔" میں نے کہا "ہم یقیناً کیپ پورٹ لینڈ سے گزر چکے ہیں اور اس وقت سمندر کے نیچے جنوب مغرب میں ہیں۔"

"سمندر کے نیچے۔" ہمارے چچا نے مسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ سمندر اس وقت ہمارے سروں کے اوپر ہے۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے البرٹ؟" کیا شمالی انگلستان میں ایسی کوئلے کی کانیں نہیں ہیں جو سمندر کے نیچے تک چلی گئی ہیں۔"

یہ قدرتی بات تھی، مگر مجھے پسند نہیں تھا کہ میرے سر پر اتنا بڑا پہاڑ یا سمندر ہو۔

چار روز بعد، ہفتہ اٹھارہ جولائی کو ہم گرینائٹ چٹانوں کے ایک بڑے سے ہال میں پہنچ گئے۔ میرے چچا نے ہانس کو اس کی ہفتے بھر کی اجرت ادا کی۔ یہ طے پایا کہ اگلے دن آرام کیا جائے۔

اس لیے ہفتے کی صبح میں بہت کاہلی سے اٹھا۔ ہم اب اپنا وقت زمین کی تہہ میں گزار

رہے تھے۔ مجھے شاید ہی کبھی سورج، ستاروں یا درختوں اور قصبوں کا خیال آتا تھا۔ اس لیے کہ ہم تو زمین کے نیچے دبی ہوئی معدنیات کی طرح بے جان تھے جنھیں ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ہمارا وفادار چشمہ اب بھی نزدیک ہی بہہ رہا تھا۔ ہم اس وقت اتنا سفر کر چکے تھے اور اتنا آگے آ چکے تھے کہ اس کا پانی اب ہمیں ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا اور ہم اسے بلا جھجک پی سکتے تھے۔

ناشتے کے بعد پروفیسر نے کہا۔ "جب ہم جرمنی واپس جائیں گے تو میں اس زیرِ زمین سفر کا نقشا بناؤں گا۔"

"چچا یہ کام تو بہت دلچسپ رہے گا، مگر کیا آپ نے تمام چیزوں کا بغور مشاہدہ کر لیا ہے؟"

"ہاں۔ میں نے ہر موڑ اور ہر ایک ڈھلان کی پیمایش اور اس کا زاویہ اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا ہے۔ قطب نما دیکھ کر بتاؤ کہ ہم کس سمت میں سفر کرتے رہے ہیں۔"

میں نے قطب نما دیکھ کر کہا۔ "جنوب سے مشرق کی طرف۔"

"بہت خوب!" پروفیسر نے کہا، پھر جلدی سے حساب لگا کر بولے۔ "میرے حساب کے مطابق ہم نے جہاں سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا وہاں سے یہاں تک دو سو تیرہ میل طے کر چکے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم بحرِ اوقیانوس کے نیچے ہیں؟"

"ہاں بالکل۔"

"ممکن ہے اس وقت ہمارے سروں پر طوفان آ رہا ہو اور بحری جہاز اچھل رہے ہوں۔"

"ہوں۔"

"اور ہمارے اس سرنگ نما راستے کے اوپر وھیل اپنی دُمیں ہلا کر ہلچل مچا رہی ہوں؟"

"اس بارے میں فکر مند مت ہو البرٹ وہ ان چٹانوں کو نہیں ہلا سکتیں۔ آؤ ایک بار پھر اندازہ لگائیں کہ ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہم سینی فلز کے جنوب مشرق میں دو سو تیرہ میل آگے پہنچ چکے ہیں اور اس وقت سطحِ سمندر سے اڑتالیس میل نیچے ہیں۔" وہ بولے۔

"اور سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ زمین کی اوپری تہ کی آخری حد ہے۔" میں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔"

"اگر آپ درست کہہ رہے ہیں تو اس وقت درجہ حرارت لازمی طور پر ڈیڑھ ہزار سینٹی گریڈ ہونا چاہیے۔"

"لازماً ہونا چاہیے میرے بچے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"اور گرینائٹ کی ان چٹانوں کو لازماً پگھل جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"مگر تم دیکھ رہے ہو گے یہ نہیں پگھل رہی ہیں۔ تھرمو میٹر کیا بتا رہا ہے۔" وہ بولے۔

"ستائیس عشاریہ چھے درجہ۔" میں نے جواب دیا۔

"اس طرح سے سائنس داں چودہ سو بہتّر اعشاریہ چار درجہ غلط ہیں اور ہمفرے ڈیوی کا کہنا صحیح ہے، تم اس بارے میں کیا کہتے ہو۔" وہ بولے۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے اب بھی زمین کے مرکز کی گرمی والی تھیوری پر یقین تھا، حالانکہ مجھے گرمی نہیں لگ رہی تھی۔ غالباً ان چٹانوں کے پیچھے موجود لاوا گرمی اور حدّت کو ہم تک پہنچنے سے روک رہا تھا، مگر میں نے چچا کے سامنے یہ دلیل پیش نہیں کی اور موضوع ہی تبدیل کر دیا۔

"چچا جان۔" میں نے کہا۔ "آئس لینڈ پر زمین کا نصف قطر چار ہزار آٹھ سو میل ہوتا ہے نا؟"

"ہاں۔"

"اور ہم اس میں سے اڑتالیس میل طے کر چکے ہیں۔"

"ہاں۔"

"تقریباً بیس دنوں میں۔"

"تقریباً بیس دنوں میں۔" چچا نے جواب دیا۔

"اس حساب سے زمین کے مرکز تک پہنچنے کے لیے ہمیں دو ہزار دن درکار ہوں گے۔ یعنی تقریباً ساڑھے پانچ سال۔"

پروفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اس کے علاوہ اگر ہم ہر اڑتالیس میل نیچے کے طرف جانے کے بعد دو سو تیرہ میل سامنے کی طرف چلیں تو ہم زمین کے مرکز تک پہنچنے سے پہلے سطح پر دوبارہ نکل آئیں گے۔"

"اپنا یہ سارا حساب فراموش کر دو۔" میرے چچا نے برہمی سے کہا۔ "ایک شخص یہ سفر کر چکا ہے اور اب میں بھی کروں گا۔"

"مجھے بھی امید ہے مگر....."

"اپنی زبان کو لگام دو اور فضول باتیں نہ کرو۔ بس مونو میٹر کی طرف دیکھتے رہو۔ اس پر کیا ظاہر ہو رہا ہے؟"

"اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آگے کافی دباؤ ہے۔"

"خوب! اب تم خود ہی دیکھ لو کہ جیسے جیسے ہم بتدریج نیچے جا رہے ہیں ہمارے جسم اس ہوا کو برداشت کرتے جا رہے ہیں اور ہمیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑ رہی ہے۔"

"سوائے اس کے کہ کانوں میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔"

"اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جلدی جلدی سانس لے کر اس درد سے نجات پائی جا سکتی ہے۔"

"یقیناً۔" میں نے جواب دیا۔ میں اپنے چچا کی مخالفت کر کے انھیں ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "اتنا نیچے آنا خوش گوار لگ رہا ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہے کہ یہاں آ کر ہمیں کتنا صاف اور واضح سنائی دے رہا ہے؟"

"ہاں۔ مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔"

"کشش ثقل میں اضافہ تو نہیں ہو جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہوگا۔ کشش ثقل بڑھتی جائے گی اور ہم لوگ ہلکے پھلکے ہوتے چلے جائیں گے۔" وہ بولے۔

"پھر ہم کیسے مسلسل نیچے کی طرف سفر جاری رکھ سکیں گے۔" میں نے پھر سوال کیا۔

"ہمیں اپنی جیبوں میں پتھر بھرنا پڑیں گے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"چچا جان آپ کے پاس ہر سوال کا جواب موجود رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

بہر حال ایک سوال ایسا تھا کہ جس کا چچا جان جواب نہیں دے سکتے تھے اگر آرنی نے یہ سفر کر لیا تھا جب کے اس کے زمانے میں مونو مسٹر بھی ایجاد نہیں ہوا تھا تو اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ زمین کے مرکز تک پہنچ چکا ہے؟

لیکن میں نے چچا سے یہ سوال نہیں کیا۔ اتوار کا دن ہم نے باتیں کر کے اور پیمایش کر کے گزارا۔ میں نے احتیاط برتی اور چچا سے کوئی مخالفت مول نہیں لی۔

# میری گمشدگی

آگے راستہ مزید ڈھلوان ہو گیا تھا اس لیے ہم زمین کی تہ میں اترتے چلے گئے۔ چند دن بعد ہم مرکز کی طرف تین چار میل بڑھ گئے۔ یہ راستہ بے حد خطرناک تھا، مگر ہانس کی کوشش اور رہنمائی سے ہم نے اسے طے کر لیا۔ اس خاموش شخص نے میری اور میرے چچا کی بہت سے موقعوں پر مدد کی اور ہمیں پریشانی سے بچا لیا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ہمارا یہ رہنما اور خاموش ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے بھی بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص جسے چار دیواری میں قید کر دیا جائے رفتہ رفتہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

اس طرح سے دو ہفتے گزر گئے۔ ۷ راگست کو ہم پچھتر میل نیچے پہنچ چکے تھے۔ ہمارے سروں پر اس وقت پچھتر میل چٹانیں، سمندر اور گاؤں وغیرہ تھے! ہم یقینی طور پر

آئس لینڈ سے پانچ سو میل آگے جا چکے تھے۔

اس دن راستے کی ڈھلان قدرے کم تھی۔ میں سب سے آگے تھا۔ میرے اور چچا کے ہاتھ میں ایک ایک لالٹین تھی، میں اس سے گرینائٹ کی چٹانوں کا تجزیہ کر رہا تھا۔

ایک بار جو میں اچانک مڑا تو میں وہاں خود کو تنہا پایا۔

"اوہ! کوئی بات نہیں۔" میں نے سوچا۔ میں تیز چل رہا تھا اس وجہ سے یا پھر یہ کہ چچا اور ہانس کہیں ٹھہر گئے ہوں گے، میں ان سے بچھڑ گیا ہوں۔ مجھے واپس جانا چاہیے۔ خوش قسمتی سے چڑھائی آسان ہے، میں پندرہ منٹ تک واپس اسی راستے پر چلتا رہا، مگر مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں نے کئی آوازیں دیں، لیکن کسی نے جواب نہیں دیا۔ میری آواز باز گشت میں دم توڑ کر رہ گئی۔

اس وقت مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔

"پُرسکون رہو، گھبرانے کی بات نہیں ہے۔" میں نے بلند آواز میں کہہ کر خود کو تسلی دی۔ راستہ ایک ہی ہے اور میں سب سے آگے تھا اس لیے بچھڑ گیا اب مجھے واپس جانا چاہیے۔

میں مزید آدھے گھنٹے تک چڑھائی چڑھتا رہا۔ کئی جگہوں پر ٹھہر کر میں نے سننے کی کوشش کی کہ شاید کوئی مجھے آواز دے رہا ہو۔ کثیف اور بند ماحول میں آواز دور تک جاتی ہے، مگر حیرت انگیز طور پر وہاں سناٹا تھا۔

مجھے یقین نہ آیا کہ میں تنہا ہوں۔ میں کہیں کھو نہیں سکتا اور اگر واقعی ایسا ہو گیا ہے تو مجھے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ جو لوگ کھو جاتے ہیں وہ کوشش کر کے اپنا راستہ دوبارہ پا لیتے ہیں۔ راستہ جب کہ ایک ہی ہے اور وہ دونوں اس پر ہیں تو مجھے یقین ہے کہ میں انھیں تلاش کر لوں گا۔ بس مجھے مسلسل اس راستے پر چڑھتے رہنا ہے۔ یقیناً وہ یہ بھول گئے کہ میں سب سے آگے تھا بہر حال میں واپس پلٹ کر ان تک پہنچ سکتا تھا مگر مجھے اس کے لیے جلدی جلدی قدم اٹھانا تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ میں خود سے جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر مجھے مکمل یقین نہیں تھا۔ ہاں یاد آیا میں آگے تھا اور ہانس میرے پیچھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنے شانوں پر رکھے ہوئے سامان کو درست کرنے لگا تھا' یقیناً اس لمحے میں کچھ آگے بڑھ گیا تھا۔

زیرِ زمین بہنے والا چشمہ میرے قریب تھا بس مجھے اس کے ساتھ ساتھ پیچھے جانا تھا پھر اپنے ساتھیوں میں سے میری ملاقات ہو جائے گی۔

اس خیال سے مجھے تسلی ہوئی کہ میرے چچا دانش مند ہیں اور انھوں نے ہانس کو پانی تلاش کرنے کے لیے دیواروں میں سوراخ نہیں کرنے دیا اور ہفتوں تک ہمیں پانی مہیا کرتے رہے۔ اب وہی چشمہ میری رہنمائی کرے گا۔ راستے پر چڑھائی سے پہلے میں جھک کر چشمے سے منہ ہاتھ دھونا چاہتا تھا۔

اس وقت میں سہم گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ میں خشک اور کھردرے گرینائٹ پر کھڑا ہوں' اور وہ چشمہ میرے قریب نہیں بہہ رہا ہے۔

اس لمحے مجھ پر جو مایوسی طاری ہوئی میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے مجھے زندہ دفن کر دیا گیا ہو اور میں یہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر جان دے دوں گا۔

میں نے گرینائٹ کی چٹانوں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ بہت سخت اور خشک محسوس ہوئیں!

اس وقت مجھ پر منکشف ہوا کہ جب میں نے اپنے ساتھیوں کی آوازیں سننے کی کوشش کی تھی تو مجھے سناٹا اور سکوت کیوں محسوس ہوا تھا' مگر وہ چشمہ میں نے کیسے کھو دیا؟ اس کا مطلب یہ کہ وہ راستہ دو حصوں میں تقسیم تھا' میں ایک راستے پر چلا گیا جب کہ میرے ساتھی اور وہ چشمہ دوسرے راستے پر تھے۔

میں گم ہو گیا تھا۔ ساڑھے سات سو میل چٹانی سلسلے کے نیچے گم ہو گیا تھا۔

میں ان چیزوں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرنے لگا جو میں زمین پر چھوڑ آیا تھا۔ ہمبرگ' کنکس اسٹریٹ کے مکان' چچا کے ساتھ اور آئس لینڈ تک سفر۔ مجھے مسٹر

فریڈ اور سینی فلز کا بھی خیال آ رہا تھا' مگر کیا کوئی ایسی طاقت بھی تھی جو ان چٹانوں میں راستہ پیدا کر کے مجھے نکال لے! یا کم از کم مجھے میرے ساتھیوں تک پہنچا دے؟

"اوہ چچا جان۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

میں نے سوچا کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں۔ بچپن کی یادیں میرے ذہن میں آنے لگیں اور میں دوزانو ہو کر دعا کرنے لگا۔

اس طرح مجھے قدرے سکون پہنچا اور میں صورت حال کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے قابل ہو سکا۔

میری پانی کی بوتل بھری ہوئی تھی اور کھانا اتنا تھا کہ تین دن تک چل سکے۔ اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں اوپر جاؤں یا نیچے؟ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اوپر جانا چاہیے' کم از کم اس مقام تک جہاں کے میں نے چشمے کو چھوڑا تھا۔ پھر جب چشمہ میرے قدموں میں ہو گا تو پھر میں اس کے سہارے سینی فلز کی چوٹی تک پہنچ سکوں گا۔

یہ بات میں نے پہلے کیوں نہیں سوچی تھی؟ اس طرح سے میری جان بچ سکتی تھی۔ مجھے لازماً اس چشمے کو دوبارہ تلاش کرنا تھا!

میں اپنی فولادی چھڑی پر زور دے کر پھر چلنے لگا۔

میرے قدم اس راستے کے نشیب و فراز سے مانوس تھے اور میں جانتا تھا کہ کہاں سیدھا جانا ہے اور کب مڑنا ہے۔ مگر اس وقت مجھے راستہ نامانوس محسوس ہوا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ راستہ ختم ہو گیا اور میں دھماکے سے ایک ٹھوس چٹان سے ٹکرا کر گر گیا۔

خوف اور مایوسی سے میں وہاں ساکت پڑا رہا' میری آخری امید بھی اب ختم ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اب کبھی یہاں سے نہیں نکل سکوں گا اور مجھے ایک خوف ناک موت آ جائے گی۔ میں نے تھوڑی دیر بعد آوازیں دینا شروع کر دیں' لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ فضا میں کثافت بڑھ گئی تھی اور میں بمشکل سانس لے پا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں ایک نئے خوف کا شکار ہو گیا۔ جب میں چٹان سے ٹکرا کر گرا تھا تو میری لالٹین ٹوٹ گئی تھی' اب اس کی روشنی رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بجھنے والی ہو۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں بند کر لوں۔ وہ روشنی ختم ہو رہی تھی..... ختم ہو رہی تھی..... بالآخر وہ ختم ہو گئی اور مکمل تاریکی چھا گئی۔

میرے ہونٹوں سے ایک لرزہ خیز چیخ نکلی۔ اس گھٹاٹوپ تاریکی میں مجھے ایسا لگا جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ میں کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلا دیے تاکہ میں کسی چیز سے ٹکرا نہ جاؤں۔ راستہ ڈھلوان تھا اور میں مسلسل نیچے ہی نیچے جا رہا تھا' میں چیخ رہا' رو رو ہا' تیز نوکیلی چٹانوں سے رگڑ کھا کر زخمی ہو رہا اور اپنے چہرے سے ٹپکنے والے خون کو صاف کرتا جا رہا تھا۔ میں بھاگ رہا تھا مگر مجھے قطعی معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ پھر میں زمین پر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے اپنا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا پایا۔ میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ معلوم کر سکوں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا۔ مجھ سے زیادہ اس وقت دنیا میں کوئی تنہا نہیں ہو گا۔

میرا جسم زخموں سے چور تھا اور جگہ جگہ سے خون رِس رہا تھا۔ میں اس بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ میری تکلیف اتنی شدید تھی کہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں مر جاتا تو بہتر ہوتا۔ میں لڑھک کر دوسری چٹانی دیوار کی طرف چلا گیا۔

تب مجھے ایک بلند اور خوف ناک گڑگڑاہٹ سنائی دی جو رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔ وہ کہاں سے آئی تھی؟ غالباً کوئی زیرِ زمین دھماکا ہوا تھا۔

میں کان لگا کر سننے لگا کہ ممکن ہے کہ ایسی گڑگڑاہٹ دوبارہ ہو' مگر پندرہ بیس منٹ یونہی خاموشی میں گزر گئے۔

میرے کان چونکہ دیوار سے لگے ہوئے تھے چنانچہ مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ وہ

کافی دور سے آ رہی تھیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔

"یہ میرا وہم ہے۔" میں نے مضطرب ہو کر سوچا۔

مگر نہیں۔ دوبارہ کان لگانے پر مجھے پھر باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ مجھ پر اتنی نقاہت طاری تھی کہ میں اس گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ بہر حال مجھے اس کا یقین تھا کہ کوئی بول رہا ہے۔

ایک لمحے کے لیے میں خوف زدہ ہو گیا کہ شاید وہ میری ہی خود کلامی تھی جو بازگشت پیدا کر کے میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ غالباً لاعلمی میں، میں دیر تک چیختا رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے اور اپنے کان دوبارہ دیوار سے لگا دیے۔

"ہاں۔ کوئی باتیں کر رہا ہے۔"

میں گھسٹتا ہوا چند فیٹ مزید دیوار کے قریب گیا تو مجھے واضح آوازیں سنائی دیں، اور کسی نے افسردہ لہجے میں کہا وہ گم ہو گیا، کون بول رہا تھا یقیناً وہ میرے چچا تھے یا ہانس اگر مجھے ان کی آواز سنائی دے رہی تھی تو لازماً انھیں میری آواز بھی سنائی دے گی۔

"مدد!" میں پوری قوت سے چیخا۔ "مدد۔"

میں جواب کا انتظار کرتا رہا، مگر تاریکی سے کوئی جواب، چیخ یا کسی کے سانس لینے تک کی آواز نہیں آئی۔ غالباً میری آواز نحیف تھی اور میرے ساتھیوں کے کانوں تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔

"وہی لوگ ہوں گے۔" میں نے خود سے کہا۔ "اور ان کے علاوہ پچھتر میل زمین کے نیچے کون آ سکتا تھا؟"

میں نے ایک بار پھر دیوار سے کان لگائے۔ ایک مقام پر مجھے وہ آوازیں بہت واضح اور بلند سنائی دیں۔ "گم ہو گیا۔" کسی نے کہا اور اس کے بعد وہی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ پھر میں نے اپنا نام سنا۔ وہ میرے چچا تھے اور گائڈ سے باتیں کر رہے تھے۔

اچانک میں ساری بات سمجھ گیا۔ وہ آوازیں دیوار کی دوسری طرف سے نہیں آ رہی تھیں، آ بھی نہیں سکتی تھیں اس لیے کہ وہ گرینائٹ کی ٹھوس دیواریں تھیں۔ وہ آوازیں دیواروں کے ساتھ ساتھ اور ان سے لگ کر آ رہی تھیں۔

اب مجھے جلدی کرنا تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے چچا دیوار سے دور چلے جائیں۔ میں نے اپنا چہرہ دیوار سے ٹکایا اور واضح الفاظ میں کہا "چچا بروک!"

چند سیکنڈ گزر گئے جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ پھر یہ الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے:

"البرٹ، البرٹ کیا یہ تم ہو؟"

"ہاں ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم کہاں ہو؟"

"میں تاریکی میں گم ہو گیا ہوں۔"

"تمھاری لالٹین کیا ہوئی؟" انھوں نے پوچھا۔

"وہ بھی گم ہو گئی۔"

"اور چشمہ؟"

"وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔"

"البرٹ!" میرے بچے باتیں کرتے رہو۔"

"میں بہت تھک گیا ہوں، آپ باتیں کیجیے۔"

"حوصلہ رکھو۔" میرے چچا نے کہا۔ "ہم لوگ اس راستے پر چڑھ اور اتر رہے تھے مگر ہمیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے بچے! میں نے تمھاری یاد میں آنسو بہائے ہیں۔ آخر کار ہم چشمے کے ساتھ ساتھ نشیب میں چلے گئے اور پھر ہم نے اپنی بندوقوں سے فائرنگ کی۔ ہم ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے۔ البرٹ، مایوس نہ ہو ہم کم از کم ایک دوسرے کی آوازیں تو سن سکتے ہیں نا؟"

ان کے حوصلہ دلانے پر میرے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن روشن ہوئی۔

"چچا جان!" میں نے دیوار سے ہونٹ لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میرے بچے۔" چند سیکنڈ بعد ان کی آواز آئی۔

"ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ آپ کے پاس کرونو میٹر ہے؟"

"ہاں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر آپ میرا نام لیجیے اور وقت نوٹ کر لیجئے۔ مجھے جیسے ہی آپ کی آواز سنائی دے گی میں اپنا نام دہراؤں پھر آپ یہ دیکھیے گا کہ میری آواز آپ تک کتنی دیر میں واپس آئی۔"

"ٹھیک ہے کیا تم تیار ہو؟"

"ہاں۔"

"میں تمھارا نام پکارتا ہوں۔"

مجھے جیسے ہی "البرٹ" سنائی دیا میں نے دہرایا۔ "البرٹ!" پھر انتظار کرنے لگا۔

"چالیس سیکنڈ۔" میرے چچا نے کہا۔ "میں نے البرٹ کہا اور تم نے اس کا جواب دیا تو یہ سب چالیس سیکنڈ میں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آواز نے ایک طرف کا فاصلہ بیس سیکنڈ میں طے کیا۔ آواز ایک سیکنڈ میں ۱۰۲۰ فیٹ کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس طرح سے ۲۰۴۰۰ فیٹ بنے یا تقریباً چار میل۔

"چار میل!" میں بڑبڑایا۔ "مجھے اوپر جانا چاہیے۔"

"نیچے اور میں تمھیں بتاتا ہوں کہ کیوں۔ ہم ایک بہت بڑے غار میں ہیں اور اس تک بہت سے راستے جاتے ہیں۔ تم جس راستے پر ہو وہ یقیناً یہاں تک آئے گا کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تمام دراڑیں اور راستے یہاں سے شروع ہوتے ہوں۔ اب اٹھو اور

چل پڑو۔ جب تم ڈھلان طے کرلو گے تو تم ہمیں اپنے بازو پھیلائے اپنا استقبال کرتے دیکھو گے۔ آؤ' میرے بچے آؤ۔"

ان کے جملوں سے میرا حوصلہ بڑھا۔

"چچا جان میں آرہا ہوں۔" میں چلایا۔ یہاں سے ہٹنے کے بعد میں آپ سے بات نہیں کر سکتا۔ اس لیے اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ البرٹ' اللہ حافظ۔"

یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے۔ ہماری یہ حیرت انگیز گفتگو چار میل کے فاصلے سے ہوتی رہی اور ان پُر امید لفظوں پر ختم ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر چچا کی آواز مجھ تک آرہی تھی تو درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اگر میں آواز کے اس راستے پر چلتا رہا اور میری ٹانگوں کی توانائی نے اجازت دی تو میں ان تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔ میں اٹھ گیا اور میں نے خود کو اس راستے پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ راستہ ڈھلوان تھا اور میں اس پر پھسل رہا تھا۔ میری رفتار کافی تیز تھی۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں خود کو روک سکوں۔ پھر میں پھسلتا ہی چلا گیا۔ بالکل عمودی' زمین میرے قدموں تلے سے غائب ہو گئی۔ کافی نیچے جا کر میں زمین پر گرا تو میرا سر ایک چٹان سے ٹکرا گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے خود کو نیم تاریکی میں ایک کمبل پر پڑے پایا۔ پہلی نظر چچا جان پر پڑی جنھوں نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ میری آنکھیں کھلتے دیکھ کر وہ خوشی سے چلائے۔

"یہ زندہ ہے! زندہ ہے!"

"ہاں۔" میں نے کمزور آواز میں کہا۔

"میرے پیارے بچے۔" چچا جان نے مجھے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔ "تم بچ گئے ہو۔"

ان کے جملوں اور حرکتوں سے مجھے خوشی ہوئی۔ پروفیسر کی طرف سے ایسی محبت

اور شفقت بہت کم دیکھنے کو ملتی تھی۔

پھر ہانس ہمارے قریب آیا' اس نے جب چچا کو میرا ہاتھ تھامے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھی خوشی سے جگمگانے لگیں۔

"نیا دن مبارک ہو!" وہ بولا۔

"نیا دن مبارک ہو ہانس۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "چچا جان یہ بتایئے کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔"

"کل بتاؤں گا البرٹ۔" وہ بولے۔ "آج تم بہت کمزور ہو۔"

"مگر کم از کم یہ تو بتا دیجیے وقت کیا ہوا ہے اور آج دن کون سا ہے۔"

"آج نو اگست' اتوار ہے اور رات کے گیارہ بجے ہیں۔ اب میں تمھارے باقی سوالوں کے جوابات دس تاریخ کو دوں گا۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں تین دن تک تنہا ان راستوں پر بھٹکتا رہا تھا! میں یقیناً بہت کمزور تھا اس لیے ان کے بارے میں سوچتے ہوئے سو جانا چاہتا تھا۔

دوسری صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرا بستر ان سب کمبلوں سے بنا تھا جو ہمارے استعمال میں تھے۔ وہ ایک آرام دہ غار کی طرح سے تھا اور فرش ریتیلا تھا۔ کوئی لالٹین روشن نہیں تھی' مگر ایک سوراخ سے روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ مجھے ایسی پُراسرار آوازیں سنائی دیں جیسے لہریں ساحل سے ٹکراتی ہیں' پھر ہوا چلنے کی سرسراہٹ سنائی دی۔

کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟ یا بلندی سے گرنے پر میرا سر پھٹ گیا تھا؟

"نہیں' یہ واقعی دن کی روشنی ہے' میں نے سوچا جو چٹانوں سے چھن کر آ رہی ہے اور یہ حقیقت میں لہروں کی آواز ہے۔ ہوا بھی سیٹیاں بجاتی ہوئی چل رہی ہے۔ تو کیا ہم سطح تک واپس پہنچ گئے ہیں؟ میرے چچا نے یہ مہم ترک کر دی ہے یا پھر وہ اسے کامیابی سے سر کر چکے ہیں؟"

پروفیسر دکھائی دیے۔

"صبح بخیر البرٹ!" انھوں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ "ہانس اور میں ساری رات تمھاری نگرانی کرتے رہے ہیں۔ تم گہری نیند سوئے اس لیے اب بہتر محسوس کر رہے ہو گے۔"

"یقیناً محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا "اور یہ میں اپنے کھانے کی رفتار سے ثابت کروں گا جو آپ ناشتے کے طور پر مجھے دیں گے۔"

"اوہ! تمھیں کھانے کو کچھ ملنا چاہیے میرے بچے۔ تمھارا بخار اتر چکا ہے' ہانس کا شکریہ کہ تمھارے زخم تیزی سے بھر رہے ہیں۔"

چچا نے میرے لیے کھانا تیار کیا میں نے رغبت سے کھانا شروع کیا پھر انھوں نے میرے سوالوں کے جوابات دینے شروع کر دیے۔ مجھے معلوم ہوا کہ جب میں بلندی سے نیچے گرا تھا تو سیدھا چچا جان کے بازوؤں میں آ گیا تھا۔

"یہ حیرت انگیز بات ہے کہ تم ہلاک نہیں ہوئے۔ اب ہم سے علاحدہ نہیں ہونا ورنہ پھر ہم سے کبھی نہ مل سکو گے۔" انھوں نے کہا۔

پھر کبھی؟ میں چونکا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی!

"کیا بات ہے البرٹ؟" انھوں نے فوراً پوچھا۔

"میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے کہا تھا کہ میں ٹھیک ہو چکا ہوں۔"

"ہاں۔"

"اور میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی ہے۔"

"ایک بھی نہیں۔"

"اور میرا سر؟"

"تمھارا سر سلامت ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میرا دماغ صحیح نہیں ہے۔"

"تمھارا دماغ؟" وہ چونکے۔

"ہاں۔ ہم سطح پر تو نہیں پہنچے ہیں' یا پہنچ چکے ہیں؟"

"نہیں یقیناً نہیں۔"

"پھر لازماً میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے سورج کی روشنی نظر آ رہی ہے اور مجھے سمندر کی آواز اور ہوا کا شور سنائی دے رہا ہے۔"

"اوہ' بس یہی الجھن ہے؟"

"کیا آپ اس کی وضاحت نہیں کریں گے؟"

"میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا' تم یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

"تو پھر باہر چلنا چاہیے۔" میں چلایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"نہیں البرٹ' کھلی ہوا ممکن ہے تمھیں نقصان پہنچا دے۔"

"کھلی ہوا؟" میں نے تعجب سے دہرایا۔

"ہاں۔ ہوا کچھ بھاری ہے۔"

"لیکن میں خود کو بالکل صحیح محسوس کر رہا ہوں۔"

"میرے بچے ذرا صبر کرو۔ ہمارا سمندری سفر قدرے طویل ہو سکتا ہے۔"

"سمندری سفر؟" میں نے چونک کر دہرایا۔

"ہاں۔ آج اور کل آرام کر لو۔ پھر ہم بحری سفر شروع کریں گے۔"

"بحری سفر؟" میں نے کہا۔ کیا یہاں کوئی جھیل یا دریا وغیرہ تھا؟ کیا کوئی بحری جہاز کسی زمین دوز بندرگاہ پر لنگر انداز ہمارا انتظار کر رہا تھا؟ میرا تجسس اتنا بڑھا ہوا تھا کہ میرے چچا نے مجھے اس کے بارے میں بتانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے جلدی سے لباس پہنا ایک کمبل اپنے جسم پر لپیٹا اور غار سے باہر آ گیا۔

# زمین دوز سمندر

شروع میں تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ میری آنکھیں چونکہ روشنی کی عادی نہیں تھیں اس لیے فوراً ہی بند ہو گئیں۔ جب میں انھیں کھولنے کے قابل ہو سکا تو مجھے خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔

"سمندر!" میں چیخا۔

"بحیرۂ بروک۔" چچا جان نے کہا۔ "میں نے اسے دریافت کیا ہے لہٰذا مجھے حق ہے کہ اسے اپنے نام سے پکاروں۔"

دور تک پانی پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک سمندر تھا جس کا ساحل ڈھلوان تھا۔ وہاں سنہری ریت بچھی تھی اور ان پر چھوٹے بڑے گھونگے پڑے تھے۔ لہریں کناروں تک آ کر ان سے ٹکرا رہی اور حیرت انگیز گونج پیدا کر رہی تھیں۔ ہوا کے ایک جھونکے سے ننھی ننھی بوندیں آ کر میرے چہرے پر پڑیں۔ ساحل کے پیچھے چٹانیں تھیں جو کافی بلندی تک چلی گئی تھیں۔

وہ ایک حقیقی سمندر تھا جو وحشیانہ انداز میں جھاگ بہا رہا تھا مگر سنسان پڑا تھا۔

اور وہ روشنی جو مجھے دکھائی دے رہی تھی نہ تو سورج کی روشنی کی طرح گرم اور چمک دار تھی اور نہ ہی چاندنی کی طرح ٹھنڈی اور پیلاہٹ لیے ہوئے تھی۔ وہ سرد، طاقتور اور سفید روشنی تھی جیسے کہ بجلی کی روشنی ہوتی ہے!

میرے سر پر ستاروں بھرے آسمان کے بجائے گہرے بادل تھے۔ انھیں دیکھ کر میں افسردہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ ان بادلوں کے اوپر گرینائٹ کی چٹانیں ہیں۔

ہم یقیناً کسی غار میں تھے، حالانکہ یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس کی لمبائی چوڑائی کیا ہے۔ سمندر کی طرح اس کا ساحل بھی اتنی دور تک پھیلا ہوا تھا کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا، جب کہ میں نے اندازہ لگایا کہ بادل تقریباً بارہ ہزار فیٹ کی بلندی پر تھے۔

اب تک کسی شخص نے ایسا کوئی غار نہیں دیکھا ہوگا جس میں کہ بادل، بجلی کی روشنی اور کشادہ سمندر نظر آئے۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نظارے کو بیان کرنے کے لیے نئے لفظوں کی ضرورت تھی اور میں ایسے الفاظ وضع کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے دیکھا میں نے سوچا پھر حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبے سے اس کی تعریف کی۔

مگر چچا جان نے ان حیرت انگیز چیزوں کی تعریف نہیں کی۔

"کیا تمھارے بدن میں اتنی طاقت ہے کہ میرے ساتھ تھوڑی دور تک چل سکو؟" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ چالیس دن تک زمین کے نیچے رہنے کے بعد اس بھیگی ہوئی نمکین ہوا میں سانس لیتے ہوئے خوش گوار لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے تو میرا بازو پکڑ لو۔ آؤ اب ساحل کے ساتھ ساتھ چلیں۔" انھوں نے کہا۔

بائیں جانب جہاں چٹانیں ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں، پانی ان پر سے بہتا ہوا نیچے گر رہا تھا اور سمندر میں شامل ہو رہا تھا۔ وہ ہمارا وفادار چشمہ تھا جس کی رہنمائی میں ہم آگے بڑھ رہے تھے۔

"مستقبل میں یہ ہم سے جدا ہو جائے گا۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"کیا احمقانہ بات ہے۔" پروفیسر نے ناگواری سے کہا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون سا چشمہ ہمارے ساتھ ساتھ بہتا رہا ہے۔"

تقریباً پانچ سو گز کے بعد ایک عجیب سا جنگل دکھائی دیا۔ اس کے درخت کھلی ہوئی چھتریوں کی طرح لگ رہے تھے اور چونکہ وہاں ہوا نہیں چل رہی تھی لہٰذا وہ ساکت تھے اور پتھر کے بنے لگ رہے تھے۔

انھیں دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی اور میں دوڑ کر ان کے قریب پہنچ گیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیسے درخت ہیں۔ جب میں اس کے سایے میں پہنچا تو اس کی تعریف کیے

بغیر نہیں رہ سکا۔

"یہ کھمبیوں کا جنگل ہے۔" چچا نے بتایا۔

وہ درست کہہ رہے تھے لیکن یہ کیسی کھمبیاں تھیں؟ مجھے ایسی کھمبیوں کے بارے میں معلوم تھا جو آٹھ یا نو فیٹ تک کی ہوتی تھیں مگر یہ کھمبیاں سفید تھیں اور ان کی جسامت تیس سے چالیس فیٹ تک تھی' اور ان کے سر بہت بڑے بڑے تھے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھیں اور ایک دوسرے سے اس قدر جڑی ہوئی کہ روشنی کا بالکل گزر نہیں تھا۔

میں کچھ اور آگے جانا چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے تک ہم اس ٹھنڈے' مرطوب اور سایے دار جنگل میں گھومتے رہے پھر ساحل کی طرف لوٹ آئے۔

اس کے علاوہ کئی درخت ایسے بھی تھے جن کی پتیاں بے رنگ تھیں۔ یہ ایسے خودرو پودے تھے جو زمین پر نکل آتے ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دیتا' مگر یہاں وہ دیو قامت ہو گئے تھے۔

"شاندار' عمدہ۔" چچا چیخے۔ "یہ ہمارے باغوں میں اگنے والے پودے ہیں جو کسی زمانے میں درخت ہوا کرتے تھے۔ البرٹ ان کی طرف دیکھو اور ان کی تعریف کرو۔ اور ذرا ان ہڈیوں کی طرف بھی دیکھو جن پر تم چل رہے ہو۔"

"ہڈیاں!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں' ہاں۔ یہ قبل از تاریخ کے دیوزاد جانوروں کی ہڈیاں ہیں۔" چچا بولے۔

میں نے اس میں سے ایک ہڈی اٹھالی۔

"یہ کسی جانور کا نچلا جبڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور وہ ٹانگ کی ہڈی پڑی ہے۔ یہ جانور اس زمین دوز سمندر کے قریب اور ان دیو قامت پودوں میں رہتے ہوں گے۔ مجھے چند جانوروں کے مکمل ڈھانچے بھی دکھائی دے رہے ہیں۔"

مجھے خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان جانوروں میں سے کوئی ابھی تک زندہ ہو اور

اس سرد جنگل میں گھوم رہا ہو یا کسی چٹان کے پیچھے چھپا بیٹھا ہو۔ میں نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا' مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

اس زمین دوز دنیا میں ہم دونوں ہی زندہ مخلوق تھے۔ جب ہوا رُک گئی تو وہاں کسی ریگستان سے زیادہ سناٹا طاری ہو گیا۔ میں نے افق کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ سمندر کہاں ختم ہوتا ہے؟ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی ہے؟ کیا ہم کبھی اسے پار کر سکیں گے؟

چچا جان کو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ہم اسے پار کر سکیں گے۔ جب کہ میں امید اور مایوسی کے بیچ میں تھا' مجھے اندیشہ اور وسوسے ڈرا رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد ہم ساحل کے ساتھ ساتھ غار میں واپس آ گئے۔ پھر میں گہری نیند سو گیا۔

میں اگلے روز بیدار ہوا تو پوری طرح صحت مند تھا۔ میں نے تازہ دم ہونے کے لیے چند منٹ تک سمندر میں تیراکی کی اس کے بعد جب میں واپس آیا تو میری بھوک کھل چکی تھی۔

باورچی ہانس تھا اور اب جب کہ اسے آگ اور پانی دونوں میسر تھے تو وہ معمول سے اچھے کھانے تیار کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کافی پلائی۔ اس سے پہلے مجھے یہ مشروب اتنا خوش ذائقہ کبھی نہیں لگا تھا۔

چچا جان نے کہا "اب سمندر میں مدوجزر پیدا ہو رہا ہے اور ہمیں اس کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔"

"مدوجزر؟" میں نے کہا۔

"ہاں' یقیناً۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ چاند اور سورج کا اثر یہاں بھی پڑتا ہے؟"

"کیوں نہیں؟" وہ بولے۔

اس وقت ہم ریتلے ساحل پر چل رہے تھے اور وہاں موجیں واقعی چڑھ رہی تھیں۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "مجھے اپنی آنکھوں پر مشکل ہی سے

یقین آرہا ہے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ زمین کے اندر اتنی گہرائی میں ایک سمندر ہوگا اور اس میں مد و جزر بھی پیدا ہو رہا ہوگا اور یہاں ہوائیں چل رہی ہوں گی اور طوفان بھی آرہا ہوگا۔"

"کیوں نہیں سوچا تھا؟" چچا نے کہا۔ "کیا اس میں سائنس اور منطق کے خلاف کوئی بات ہے۔"

"کوئی بات خلاف نہیں ہے، بشرطیکہ ہم مرکزی حرارت کے نظریے کو چھوڑ دیں۔"

"ہمفرے ڈیوی کا کہنا صحیح تھا؟"

"یقیناً اور ایسے سمندر اور براعظم اور بھی ہوں گے اور ان میں مچھلیاں بھی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کانٹے اور بنسیاں وغیرہ بنالینا چاہئیں۔"

"ضرور بنائیں گے البرٹ۔ اس نئے علاقے میں جو کچھ بھی ہے وہ ہمیں دریافت کرنا چاہیے۔"

"مگر چچا جان اس وقت ہم کہاں ہیں؟ میں نے یہ بات آپ سے اب تک نہیں پوچھی؟"

"ہم آئس لینڈ سے آٹھ سو پچھتر میل آگے ہیں۔"

"ہم اتنی دور آگئے ہیں؟ کیا ہمارا قطب نما اب بھی جنوب مشرق کی سمت ظاہر کر رہا ہے؟"

"ہاں۔"

"اور ہم کتنی گہرائی میں پہنچ چکے ہیں؟"

"اٹھاسی میل۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہمارے سروں پر ہیں؟"

"ہاں۔" پروفیسر نے قہقہہ لگایا۔ "اسے سنبھالنے کے لیے بہت مضبوط سہارا

چاہیے' مگر یہ چھت بہت ٹھوس ہے اور اس میں عمدہ قسم کا مسالہ لگا ہوا ہے۔"

"اوہ' میں چھت گرنے سے خوفزدہ نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ بتایئے کہ اب آپ کا منصوبہ کیا ہے؟"

"ہم مسلسل نیچے جاتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھیں گے' کیونکہ اب تک ہمیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔"

"مگر اس پانی کے نیچے ہم کیسے جائیں گے؟"

"میں اس پانی میں غوطہ لگانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے توقّع ہے کہ دوسرے کنارے پر پہنچ کر ہمیں نئے راستے مل جائیں گے۔"

"آپ کے خیال میں دوسرا کنارہ کتنی دور ہے؟"

"ستر سے سو میل کے درمیان۔"

میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ اندازہ قطعی غلط ہو سکتا ہے کہا: "اب ہمیں قطعی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے اور کل سے سمندری سفر شروع کر دینا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے' ہم کل سے بحری سفر شروع کر دیں گے۔"

میں نے کہا "مگر کشتی کہاں ہے؟"

"کشتی نہیں میرے بچے' بلکہ لٹھوں سے بنایا ہوا مضبوط اور اچھا بیڑا ہو گا۔"

"بیڑا!" میں چیخا۔ "مگر ایک کشتی کے مقابلے میں بیڑا تیار کرنا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے کہ....."

"تم اپنا خیال نہ ظاہر کرو البرٹ بلکہ تم کان لگاؤ تو تمھیں سنائی دے گا۔"

"سنائی دے گا۔"

"ہاں ٹھونکنے پیٹنے کی آوازیں۔ ہانس یہ کام پہلے سے کر رہا ہے۔ آؤ دیکھو۔"

پندرہ منٹ تک چلنے کے بعد ہم نے ہانس کو ایک چٹان کے پیچھے قدرتی بندرگاہ پر

کام کرتے دیکھا۔ ریت پر ایک نامکمل سا بیڑا پڑا ہوا تھا۔ وہ کسی عجیب سے درخت کے تنوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا' بہت سے تنے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔

"چچا جان یہ کون سی لکڑی ہے۔"

"یہ فوسل لکڑی ہے میرے بچے' ایسی لکڑی جو سمندری پانی کے عمل سے معدنیات میں تبدیل ہو گئی ہے۔"

"یقیناً پھر تو یہ پتھر کی طرح سخت اور وزنی ہو گئی ہو گی۔ اور پانی پر تیر نہیں سکے گی؟"

"ایسے درخت جو پوری طرح سے فوسل نہیں بن سکے ہیں وہ تیر سکیں گے' یہ دیکھو۔" چچا جان نے کہا پھر ایک ٹکڑا پانی میں پھینک دیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا' مگر چند لمحوں بعد سطح پر ظاہر ہوا اور تیرنے لگا۔

"حیرت انگیز!" میں نے چلّا کر کہا۔

دوسری شام تک بیڑا تیار ہو گیا۔ وہ دس فیٹ لمبا اور پانچ فیٹ چوڑا تھا۔ اس کے تنے آپس میں مضبوط رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کا مستول دو ٹہنیوں پر مشتمل تھا جو آپس میں مضبوطی سے بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے عرشے پر ہمارا ایک کمبل بچھا ہوا تھا۔ ہم نے اسے پانی میں دھکیلا تو وہ پُر سکون انداز میں بحیرۂ بروک سمندر پر تیرنے لگا۔

# بحری سفر کی ابتدا

۱۳ر اگست کو ہم صبح ہی اٹھ گئے کیونکہ ہمیں اس نئے اور آسان راستے پر سفر کرنا تھا۔ ہم نے عرشے پر ضرورت کی ہر چیز رکھ دی تھی۔ کھانے پینے کا سامان' اوزار' ہتھیار' آگ تیار کرنے کا سامان اور تازہ پانی کی ایک بڑی مقدار۔ چھے بجے پروفیسر نے ہمیں بیڑے پر سوار ہونے کا حکم دیا۔

اس بیڑے کو ہانس چلا رہا تھا۔ میں نے وہ رسّی کھول دی جس کے ذریعے سے ہم ساحل سے بندھے ہوئے تھے۔ بیڑا سمندر میں رواں ہو گیا۔ جب ہم بندرگاہ کو چھوڑ رہے تھے تو چچا جان نے تجویز پیش کی کہ ہمیں اسے کوئی نام دینا چاہیے۔ "جولی۔" میں نے تجویز کیا۔ "آپ کو اپنے نقشے پر پورٹ جولی لکھتے ہوئے اچھا لگے گا۔"

"ہاں پورٹ جولی مناسب رہے گا۔" چچا نے اس سے اتفاق کیا۔

ہوا اس وقت شمال مغرب سے چل رہی تھی، ہم اسے کاٹتے ہوئے تیزی سے سفر کر رہے تھے۔

"اگر ہم اسی رفتار سے چلتے رہے تو ہم چوبیس گھنٹوں میں پچھتر میل سفر طے کر لیں گے اور اس وقت ہم دوسرے کنارے پر پہنچ چکے ہوں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بیٹھ کر موجوں کو دیکھنے لگا۔ جلد ہی ہم اتنا آگے آ گئے کہ کنارہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دوپہر کے وقت سمندری گھاس کے بڑے بڑے ٹکڑے تیرتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ یہ سمندری گھاس بعض اوقات اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ بحری جہازوں کو روک لیتی ہے۔ مگر بحیرہ بروک میں وہ ٹکڑے اتنے بڑے تھے کہ میں نے ان کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ میں حیران تھا کہ قدرت نے آخر سمندر کو ایسی کون سی قوت عطا کر رکھی ہے جو اس گھاس کو پیدا کرتی ہے۔

جب شام ہوئی تو زیادہ تاریکی نہیں پھیلی۔ اس سمندر کے اوپر روشنی یکساں تھی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں مستول کے پاس لیٹ کر سو گیا۔ مجھے خوب اچھی نیند آئی۔

چچا جان کی ہدایت کے مطابق دوسرے روز میں نے اس بحری سفر کی ڈائری لکھنا شروع کی۔ یہاں اس کے بارے میں وہ نوٹس ہیں جو میں نے تیار کیے ہیں۔

۱۴ر اگست، جمعہ

شمال مغرب سے ہوا مناسب انداز سے چل رہی ہے۔ بیڑا تیزی سے سیدھا چل رہا ہے۔ ساحل پچھتر میل کے فاصلے پر ہے۔ افق صاف ہے۔ روشنی یکساں ہے۔ موسم عمدہ ہے۔ درجہ حرارت بتیس درجہ سنٹی گریڈ ہے۔

دوپہر کو ہانس نے ایک فولادی کانٹے میں تھوڑا سا گوشت لگایا اور اسے سمندر میں پھینک دیا۔ دو گھنٹے تک اسے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہم نے سوچنا شروع کر دیا کہ شاید اس سمندر کا پانی مچھلیوں کی افزائش کے لیے نامناسب ہے۔ مگر پھر ڈور کھنچنا شروع ہوئی اور جب ہانس نے اسے کھینچا تو ایک تڑپتی مچھلی باہر آ گئی۔

ہم نے اس مچھلی کو اچھی طرح سے دیکھا بھالا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ مچھلی کی طرح ہے' مگر اس کے باوجود وہ مختلف تھی۔ مثال کے طور پر اس کی دُم اور دانت نہیں تھے۔ پروفیسر نے بتایا کہ یہ مچھلی کی ایسی کوئی قسم ہے جس کی نسل ختم ہو چکی ہے اور اب انسان اس کا ڈھانچہ کہیں سے کھود کر دریافت کر لیتا ہے۔

"کیا!" میں حیرت سے چیخ پڑا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ ہم نے ایک ایسی مچھلی پکڑ لی ہے جس کی نسل ختم ہو چکی ہے۔"

"ہاں!" پروفیسر نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تمھیں اس میں ایک خاص بات دکھائی دے گی۔ یہ مچھلی جو زیر زمین پانی میں ملی ہے' اس میں ایک خاص بات ہے۔"

"ارے ہاں۔ یہ تو اندھی ہے۔" میں نے چونک کر کہا۔

"اندھی نہیں' بلکہ اس کی آنکھیں ہی نہیں ہیں۔"

میں نے ایک بار پھر مچھلی کی طرف دیکھا۔ میرے چچا جو کچھ کہہ رہے تھے وہ سچ تھا۔ مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ تمام مچھلیاں ایسی ہی ملتیں اس لیے ہم نے دوسری طرف کانٹا ڈالا۔ دو گھنٹوں میں ہم نے بہت سی مچھلیاں پکڑیں' مگر وہ سب ایسی تھیں جن کی نسل ختم ہو چکی تھی۔ ان میں سے کسی کی بھی آنکھیں نہیں تھیں۔

میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اگر یہاں ایسی مچھلیاں مل رہی تھیں تو ایسے پرندے کیوں نہیں مل سکتے تھے' جو ان مچھلیوں کا شکار کر کے زندہ رہتے ہیں۔

میرا تصور مجھے کہیں دور لے گیا اور میں قبل از تاریخ کے زمانے کے خواب جاگتی حالت میں دیکھنے لگا۔ پہلے دیوزاد جانوروں کے متعلق' پھر بڑے پرندوں کے متعلق' اور آخر میں رینگنے والے جانوروں کے متعلق جو ان سے پہلے آئے تھے۔

رفتہ رفتہ میں پہلے کے زمانے میں چلا گیا اور جانوروں سے پہلے کے زمانے کے متعلق خواب دیکھنے لگا' جب شدید گرمی میں صرف پودے اور درخت ہی دنیا میں ہوا کرتے تھے۔ پھر میں نے درختوں سے پہلے کے زمانے کو تصور میں دیکھا جب پہاڑ بھی نہیں تھے اور دنیا گیسوں کا مجموعہ تھی۔ گرم ترین جسامت' میں بڑی اور سورج کی طرح چمک دار۔ کیسا عجیب خواب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے بخار ہو گیا ہو اور میرے خیالات عجیب عجیب چیزیں دکھا رہے ہوں۔ میں نے اس خواب کی تمام تفصیل لکھ لی اور اس دوران میں دوسری تمام چیزیں بھول گیا یعنی پروفیسر گائڈ اور بیڑا مجھے یاد نہ رہا۔

"کیا بات ہے؟" میرے چچا نے پوچھا۔

میں نے ان کی طرف نظریں اٹھائیں لیکن میرے خیالات کہیں اور تھے لہٰذا وہ مجھے دکھائی نہیں دیے۔

"محتاط رہو البرٹ ورنہ بیڑے سے گر کر پانی میں ڈوب جاؤ گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ ہانس نے مجھے تھام رکھا ہے اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میں سمندر میں گر پڑتا۔

"کیا تم دیوانے ہو گئے ہو؟" پروفیسر نے چیخ کر کہا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا تم بیمار ہو؟"

"نہیں خواب دیکھ رہا تھا بہر حال اب وہ ختم ہو گیا..... سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں' ہوا مناسب ہے اور سمندر بھی پُرسکون ہے۔ ہمیں جلد ہی خشکی تک پہنچ جانا چاہیے۔"

میں نے کھڑے ہو کر افق کی طرف دیکھا۔ اب بھی سمندر اور بادلوں کے درمیان کچھ نہیں تھا۔

۱۵/ اگست' ہفتہ

ابھی تک زمین دکھائی نہیں دی۔ چچا جان کا مزاج خراب تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا غصہ اور اضطراب لوٹ آیا ہے۔

"چچا آپ کچھ فکر مند سے ہیں؟" میں نے انھیں ٹیلی اسکوپ سے افق کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے کہا۔

"فکر مند؟ ذرا بھی نہیں۔"

"مضطرب سے ہیں؟"

"ہاں۔ تھوڑا سا"

"مگر ہم تو بہت تیزی سے سفر کر رہے ہیں۔"

"اس سے کیا فائدہ؟ یہ سمندر بہت بڑا ہے۔" دل س

مجھے یاد آیا کہ پروفیسر نے اندازہ قائم کیا تھا کہ بحیرۂ بروک چوڑائی میں پچھتر میل ہے اور اب تک ہم اس کا تین گنا سفر کر چکے ہوں گے مگر جنوبی ساحل نظر نہیں آرہا ہے۔

"ہم نیچے نہیں جا رہے ہیں۔" پروفیسر نے کہا۔ "یہ وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ میں نے اس سفر پر اس لیے نہیں آیا تھا کہ ایک تالاب میں تیر تا رہوں۔"

وہ اس سفر کو تیرنا اور اس سمندر کو تالاب کہہ رہے تھے!

"مگر۔" میں نے کہا۔ "ہم تو اس راستے پر چل رہے ہیں جو آرنی نے اختیار کیا تھا۔"

"کیا واقعی؟" چچا جان نے کہا۔ "کیا آرنی اس سمندر تک آیا تھا؟ کیا اس نے اسے پار

کیا تھا؟ کیا اس چشمے نے ہمیں صحیح راستے پر ڈالا ہے؟"

"بہر حال آپ کے خیالات فکر انگیز ہیں اور....."

"مجھے خیالات کی پروا نہیں ہے۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں اور کرنے جا رہا ہوں۔ اس لیے مجھ سے خیالات کی بات مت کرو۔"

میں نے چچا جان کو تنہا چھوڑ دیا اس لیے کہ وہ مضطرب اور منتشر تھے۔ چھے بجے شام کو ہانس نے اپنی اجرت کا سوال کیا تو اسے رقم گن کر ادا کر دی گئی۔

۱۶/ اگست اتوار۔

کوئی نئی بات پیش نہیں آئی۔ موسم پہلے جیسا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے بجلی کا بلب روشن کر رکھا ہو۔ ہوا میں البتہ تھوڑی سی تازگی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سمندر کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہ بحر اوقیانوس یا بحر روم کی طرح بڑا سمندر لگ رہا تھا۔

چچا جان نے سب سے بھاری کلھاڑی اٹھائی اور اس کے ہتھے میں رسّی باندھ کر اسے سمندر میں ڈال دیا۔ وہ کلھاڑی بارہ سو فیٹ نیچے چلی گئی مگر سمندر کی تہہ نہ ملی۔ کلھاڑی کو واپس کھینچنے میں بہت دشواری پیش آئی۔

جب کلھاڑی اوپر تک گئی تو انھوں نے مجھے دکھائی کہ اس پر گہرے نشانات پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"دانت!" انھوں نے کہا۔ پھر اپنا منہ کئی بار کھول کر بند کیا تاکہ مجھے سمجھنے میں آسانی ہو۔

"دانت!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ پھر کلھاڑی پر پڑے ہوئے نشانات کو غور سے دیکھا۔ ہاں کلھاڑی پر دانتوں کے نشانات تھے' بہت طاقتور اور گہرے! کیا وہ قبل از تاریخ کے کسی عفریت کے دانتوں کے نشانات تھے جو سمندر کی تہ میں رہ رہا تھا؟ کیا وہ عفریت وہیل اور شارک سے زیادہ مہیب اور ڈراؤنا ہوگا؟ میں نے کھلی آنکھوں سے جو خواب دیکھا

تھا کیا وہ سچ ثابت ہونے والا ہے؟ میں اس خیال کو ذہن سے نہ نکال سکا۔

۱۷ر اگست، پیر

میں سارا دن ان دانتوں کے نشانات کے بارے میں اور اس رینگنے والے جانور کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا۔ کیا میری ملاقات قبل از تاریخ کے کسی عفریت سے ہونے والی تھی؟ میں نے دہشت سے سمندر کی طرف دیکھا؟ پروفیسر بروک کا بھی تقریباً یہی خیال تھا اس لیے کہ وہ بار بار کلھاڑی کا جائزہ لے رہے تھے البتہ وہ میری طرح خوف زدہ نہیں تھے۔

انھوں نے وہ کلھاڑی سمندر میں کیوں ڈالی تھی؟ میں نے خود سے کہا۔ اس سے کوئی عفریت پریشان ہو گیا ہے جو ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔

میں نے اپنی بندوقوں کی طرف دیکھا کہ وہ وقت پر کام کر سکتی ہیں یا نہیں؟

سمندر کی سطح پر مختلف لہریے بن رہے تھے۔ خطرہ قریب تھا۔ ہمیں محتاط اور چوکنا رہنا چاہیے تھا۔

۱۸ر اگست، منگل

شام ہو چکی تھی، روشنی یکساں اور ایک ہی قسم کی تھی لہٰذا اس سے وقت کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا، یا بہت زیادہ تھک گئے تھے اس لیے ہم نے یہ اندازہ لگا لیا۔ ہانس مسلسل بیڑے کو چلا رہا تھا، مجھے نیند آنے لگی۔

دو گھنٹے بعد میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ بیڑا سمندر کی سطح سے تقریباً سو فیٹ یا اس سے زیادہ اوپر اٹھا ہوا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" میرے چچا چیخے "کیا ہم خشکی پر پہنچ گئے ہیں؟"

ہانس نے ایک سیاہ چیز کی طرف اشارہ کیا جو چوتھائی میل کے فاصلے پر سمندر سے نکل رہی اور ڈوب رہی تھی۔

"یہ کوئی دیوزاد مچھلی ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"ہاں۔" چچا جان نے کہا۔ "اور وہ ادھر کوئی دیو قامت سمندری چھپکلی ہے۔"

"اور اس سے بھی آگے ایک بہت بڑا مگرمچھ ہے۔ اس کے بڑے بڑے دانتوں کی قطار کو دیکھیے۔ اوہ! وہ نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔"

"یہ وھیل ہے..... وھیل ہے۔" چچا چلائے۔ "پانی کی طرف دیکھو..... وہ فوارے کی طرح گر رہا ہے۔"

ہم تعجب اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں کھڑے ان سمندری عفریتوں کو دیکھتے رہے۔ ان میں سے جو سب سے چھوٹا تھا وہ ہمارے بیڑے کو چبا کر ٹکڑے کر سکتا تھا۔ ہانس مڑنا چاہتا تھا، مگر دوسری طرف سے اسے ایک بہت بڑا کچھوا دکھائی دیا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ وہ کچھوا تقریباً چالیس فیٹ لمبا تھا اور اس نے تیس فیٹ لمبے ایک سانپ کا سر منہ میں دبا رکھا تھا اور اسے دائیں بائیں لہروں پر پٹخ رہا تھا۔ ان سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔ وہ سارے جانور تیزی سے بیڑے کے نزدیک آ رہے تھے۔ میں نے اپنی رائفل اٹھالی، مگر یہ سوچ کر رہ گیا کہ اس کی ننھی سی گولی ان عفریب کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟

خوف اور دہشت سے ہمیں سکتہ ہو گیا تھا۔ مگرمچھ اور سانپ تیزی سے قریب آ رہے تھے۔ جبکہ باقی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں فائر کرنے کے لیے تیار تھا، مگر ہانس نے مجھے روک دیا۔ وہ دونوں عفریت ہمارے بیڑے سے تقریباً سو فٹ کے فاصلے سے گزر گئے اور انھوں نے ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

پھر تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر جنگ شروع ہو گئی۔ ہمیں دونوں عفریت ایک دوسرے کو اپنے دانتوں میں دبائے نظر آ رہے تھے۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ دوسرے عفریت واپس آ گئے ہیں اور اس جنگ میں شامل ہو گئے ہیں۔ میں ہانس کی توجہ اس طرف دلائی مگر اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"صرف دو جانور ہیں۔" وہ بولا۔

"یہ درست کہہ رہا ہے۔" میرے چچا نے کہا جو ٹیلی اسکوپ لیے ہوئے تھے۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے احتجاج کیا۔

"ہاں۔ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ ان عفریتوں میں سے پہلے کی ناک مچھلی کی طرح' سر چھپکلی جیسا اور دانت مگرمچھ جیسے تھے۔ وہ قبل از تاریخ کا سب سے دہشت ناک جانور اکتھیوسارس ہے۔"

"اور دوسرے؟"

"دوسرا پہلے کا دشمن ہے۔ ایک سانپ جس کا خول کچھوے جیسا ہے اسے پیلیسورس کہتے ہیں۔"

ہانس صحیح کہہ رہا تھا۔ سمندر کی سطح پر صرف دو عفریت کلبلا رہے تھے۔ ایک اکتھیوسارس جو تقریباً سو فیٹ لمبا تھا اور جس کی آنکھیں کسی شخص کے سر کے برابر تھیں' اور ایک پیلیسورس جس کی گردن سمندر سے تیر فٹ اوپر اٹھی ہوئی تھی۔

وہ دونوں شدید غصے میں ایک دوسرے پر اس طرح حملہ آور ہو رہے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ ان کی لڑائی سے پانی کی سطح پر اتنی اونچی اونچی لہریں پیدا ہو رہی تھیں اور ہمارے بیڑے تک پہنچ رہی تھیں کہ وہ الٹتے الٹتے بچا۔ وہ لڑائی میں مہیب آوازیں نکال رہے تھے اور ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عفریت کہاں سے شروع ہوتا اور دوسرا کہاں ختم ہوتا ہے۔

ایک گھنٹہ' اور پھر دو گھنٹے گزر گئے اور لڑائی پوری شدت سے جاری رہی۔ ہم حرکت کے بغیر اپنی جگہوں پر کھڑے تھے اور فائرنگ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

اچانک دونوں عفریت سطح کے نیچے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے سوچا کیا ان کی لڑائی سمندر کی تہہ میں جا کر ختم ہو گئی؟"

چند منٹ اس طرح گزر گئے۔ پھر ایک بڑا سر سطح پر نمودار ہوا جو پیلیسورس کا تھا۔ وہ مر رہا تھا اور اپنا سر کرب و اذیت میں سطح پر مار رہا تھا۔ پانی چھینٹوں کی صورت میں اڑ رہا اور ہمیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر جلد ہی اس کی شدت اور غیظ و غضب کم ہو گیا اور سانپ کا جسم پانی کی پُر سکون لہروں پر تیرنے لگا۔

۱۹/اگست' بدھ

ہماری خوش قسمتی سے تیز ہوا چلنے لگی اور جلد ہی ہمیں اس لڑائی کے منظر سے دور لے گئی ہانس اب بھی بیڑہ کو کھے رہا ہے۔ چچا جان اضطراب اور بے چینی سے افق کو دیکھ رہے ہیں۔

۲۰/اگست' جمعرات

ہوا نارمل تھی۔ درجہ حرارت بلند۔ بیڑے کی رفتار نوے ناٹ تھی۔ دوپہر کے قریب ہم نے کافی فاصلے سے ایک گرج سنی جو مسلسل آ رہی تھی۔

ہانس نے مستول پر چڑھ کر دیکھا مگر اسے کچھ نظر نہیں آیا۔

تین گھنٹے گزر گئے۔ وہ گھن گرج کسی آبشار کی معلوم ہوتی تھی' میں نے اپنے خیال سے چچا کو آگاہ کیا تو انھوں نے انکار میں سر ہلایا۔ بہر حال چند میل کے فاصلے پر نہ کوئی چیز شور مچا رہی تھی۔ وہ آواز نہ آسمان کی طرف سے آ رہی تھی نہ سمندر کی طرف سے۔ دونوں پُر سکوت چھایا ہوا تھا۔

چار بجے کے قریب ہانس جو دوبارہ مستول پر چڑھ گیا' اس کی نگاہ افق کا جائزہ لے رہی تھی پھر اس نے ایک مخصوص نقطے نظر پر جما دی۔

"اس کو کوئی خاص چیز نظر آ گئی ہے؟" چچا جان نے پوچھا۔

"ہاں' مجھے بھی اس کا یقین ہے۔"

"ہانس نیچے آیا اور اس نے جنوب کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ وہاں پر۔" اس نے کہا۔

چچا نے اپنی ٹیلی اسکوپ سے اس طرف دیکھا اور چیخ کر کہا۔ "ہاں۔ ہاں"

"آپ کو کیا نظر آ رہا ہے؟"

"پانی کا ایک اونچا ستون سطح پر بلند ہو رہا ہے۔"

"کوئی دوسرا عفریت؟"

"غالباً۔"

"پھر ہمیں چاہیے کہ بیڑے کا رُخ مغرب کی طرف کر دیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ عفریت کتنے خطرناک ہیں۔"

"نہیں سیدھے چلو۔" چچا نے کہا۔

میں ہانس کی طرف مُڑا، مگر وہ بیڑے کو چلاتا رہا۔ جیسے جیسے ہم اس ستون کے قریب ہوتے جا رہے تھے ویسے ویسے وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ بلند معلوم ہو رہا تھا۔ یہ کون سی ایسی سمندری مخلوق تھی جو اتنا پانی اُچھال رہی تھی؟

شام آٹھ بجے ہم اس عفریت سے پانچ میل سے بھی کم فاصلے پر تھے۔ اس کا لمبا چوڑا جسم پانی کی سطح پر ساکت پڑا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی لمبائی ایک میل ہو! فضا میں پانی کا ایک ستون پانچ سو فیٹ تک بلند تھا اور بارش کی صورت میں واپس نیچے گر رہا تھا۔

ہم ایک طاقتور عفریت کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا مقابلہ سو وھیلیں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ خوف و دہشت کی ایک لہر نے مجھے جکڑ لیا۔

اچانک ہانس نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "جزیرہ۔"

"جزیرہ؟" میں نے شبہ ظاہر کیا۔

"ہاں، کیوں؟" چچا نے جواب دیا اور پھر قہقہے لگانے لگے۔

"مگر آپ پانی کے اس ستون کو کیا کہیں گے؟"

"یہ گرم چشمے کا فوارہ ہے۔" ہانس نے وضاحت کی۔

"ہاں یقیناً ہوگا۔" میرے چچا نے اس کی تائید کی۔ آئس لینڈ میں ایسے بہت سے فوارے ہیں۔"

پہلے مجھے اس پر یقین نہیں آیا کہ میں نے ایک جزیرے کو عفریت سمجھ لیا' مگر اس کا ثبوت سامنے تھا اور مجھے اسے تسلیم کرنا پڑا۔

وہ جزیرہ کسی وھیل کی طرح تھا جس کا سر سطح سے ساٹھ فٹ بلند تھا۔ کبھی کبھار ہمیں زور دار دھماکہ سنائی دیتا تھا اور پھر آسمان کی طرف پانی کا ایک ستون بلند ہو کر بادلوں تک چلا جاتا۔ بجلی کی روشنی اس کے ساتھ مل کر نت نئے رنگ پیدا کر رہی تھی۔

"آؤ ہم اس پر اتر جائیں۔" پروفیسر نے کہا۔

ہانس نے کافی دشواری سے بیڑے کا رخ اس جزیرے کی طرف کیا۔ خشکی کے نزدیک پہنچتے ہی میں نے چٹانوں پر چھلانگ لگائی اور میرے بعد چچا جان نے خشکی پر قدم رکھا۔ جب کہ ہانس بغیر کسی تجسس کے بیڑے پر کھڑا رہا۔

زمین ہمارے قدموں تلے تھرتھرا رہی تھی' اور قدرے گرم معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس چشمے پر تھرمامیٹر لگایا جہاں سے فوارہ بلند ہو رہا تھا تو اس نے درجۂ حرارت ۱۶۳ ظاہر کیا۔

یہ پانی کسی بھٹی سے گزر کر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زمین کے مرکز میں گرمی ہے۔ میں نے یہ بات پروفیسر بروک سے کہی۔

"ہم خود ہی دیکھ لیں گے۔" انھوں نے صرف اتنا کہا۔

اس جزیرے کا نام "البرٹ" رکھ کر وہ پھر بیڑے پر چلے گئے۔ ہماری غیر موجودگی میں ہانس نے بیڑے کو کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ ہم اس پر پہنچے تو ہانس نے اسے چلانے شروع کر دیا۔

اب ہم پورٹ جولی سے چھے سو پچھتر میل اور آئس لینڈ سے ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر آ چکے تھے۔

# طوفان

آج وہ گرم چشمے سے پھوٹنے والا فوآرہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا' ہوا میں تیزی تھی اس نے ہمارے بیڑے کو جزیرہ البرٹ سے بہا کر آگے کر دیا۔

موسم تبدیل ہو رہا تھا' ہوا میں بھاری پن تھا اور بجلی کی چمک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ جنوب کی طرف جو بادل تھے وہ یکجا ہو گئے اور تاریکی میں اضافہ ہونے لگا۔

وہاں اس وقت اتنی بجلی تھی کہ میرے سر کے بال کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میرا کوئی ساتھی مجھے چھولے گا تو اسے شدید جھٹکا لگے گا۔ صبح دس بجے کے قریب موسم انتہائی خراب ہو گیا۔ میں نے اس بارے میں پروفیسر کو بتایا تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کا موڈ خراب تھا اس لیے کہ سمندر ختم ہی نہیں ہونے میں آ رہا تھا اور وہ مسلسل ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ طوفان آنے والا ہے۔" میں نے کہا۔

"انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور سکوت طاری رہا۔ ہوا بھی ساکت تھی۔ بیڑا تقریباً ٹھہر گیا تھا اور آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ بادبان ہٹا دینے چاہئیں تاکہ بیڑا آگے بڑھ سکے۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"نہیں سو بار بھی نہیں۔" میرے چچا چیخے۔ "ہوا کو موقع دو کے وہ ہمیں بہا کر لے جائے۔ ممکن ہے اس طرح سے ہم کسی کنارے تک پہنچ جائیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ ہوا بیڑے سے ٹکرا کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے۔"

ابھی انھوں نے یہ جملہ ادا ہی کیا تھا کہ جنوبی افق پر تبدیلی رونما ہوئی۔ ہوا میں اچانک شدت اور تیزی پیدا ہوئی اور اس نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ گہری تاریکی پھیل گئی اور میں اس بارے میں مختصر سا نوٹ ہی لکھ سکا۔

بیڑا ایک بار شدت سے فضا میں اچھلا اور پھر آگے کو گرا' جس کی وجہ سے چچا جھٹکے سے ایک طرف لڑھک گئے۔ میں گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا ان تک پہنچا تو میں نے انھیں ایک رسی پکڑے دیکھا' شاید وہ سمجھ رہے تھے اب وہ محفوظ ہو گئے ہیں۔ ہانس اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ اس کا چہرہ پُر سکون تھا اور سرخ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ وہاں اس طرح سے کھڑا ہوا تھا جیسے قبل از تاریخ کا کوئی انسان ہو۔

تیز ہوا بیڑے کو کتنی تیزی سے لیے جا رہی تھی' میں اس کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ بیڑے کا مستول سیدھا کھڑا تھا جب کہ بیڑے کا حال اس بلبلے کی طرح سے تھا جو پھٹنے کے قریب ہوتا ہے۔

پھر تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہو گئی۔ سمندر ابلنے لگا اور بادل پھٹنے لگے۔ بجلی کے جھماکے ہو رہے تھے اور اولے گر رہے تھے۔ یہ اولے جب ہماری بندوقوں اور دھاتی چیزوں سے ٹکراتے تھے تو عجیب سی آوازیں پیدا کرتے تھے۔ سمندر کی ہر لہر کے ساتھ آگ اور شعلوں کی آمیزش ہوتی تھی' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی آتش فشاں میں سفر کر رہے ہیں۔

روشنی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی اور مجھے مشکل ہی سے کچھ نظر آ رہا تھا۔ بادلوں کی گھن گرج اتنی تیز تھی کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مستول ایک طرف کو جھکا جا رہا تھا میں اسے پکڑ کر لٹک گیا تاکہ وہ گرنے نہ پائے۔

۲۳ر اگست' اتوار

اس وقت ہم کہاں تھے؟ سمندر کی لہریں ہمیں یہاں انتہائی تیز رفتاری سے لائی تھیں۔ پچھلی رات جو بھیانک طوفان آیا تھا وہ اب تک جاری تھا۔ ہمارے کانوں سے خون بہہ رہا تھا اور آپس میں بات کرنا ممکن نہ تھا۔

بجلی چمک رہی تھی اور بادل اب بھی گرج رہے تھے۔

ہم کہاں جا رہے تھے؟ یہ سوال مجھے رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا۔ چچا جان ایک طرف ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑے ہوئے تھے۔ گرمی کی شدت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

۲۴/اگست، پیر

کیا طوفان کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا؟ میرے چچا اور میں تھک کر چور چور ہو گئے تھے۔ مگر ہانس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہ پہلے کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔ بیڑا اب بھی جنوب مشرق کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اندازے کے مطابق ہم جزیرہ البرٹ سے پانچ سو میل کے فاصلے پر آچکے تھے۔

آدھا دن گزرنے کے بعد طوفان کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ اس اندیشے سے کہ کہیں ہم لڑھک کر سمندر میں نہ جا پڑیں ہمیں خود کو عرشے سے باندھنا پڑا۔ لہریں اس وقت ہمارے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔

تین دن تک ہم آپس میں ایک بات بھی نہ کر سکے۔ میرا خیال تھا کہ چچا جان کہیں گے "ہم ختم ہو چکے ہیں۔"

# آتشی گیند

اچانک ہمارے بیڑے پر آگ کا ایک گولا نمودار ہوا۔ مستول اور پھر بیڑے کی تمام چیزیں اس کے شعلوں میں اس طرح غائب ہونے لگیں جیسے ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ وہ شعلہ آدھا نیلا اور آدھا سفید تھا جو عرشے پر پڑی ہوئی ہر ایک چیز کی طرف لپک رہا تھا۔ وہ ہانس کے نزدیک گیا، مگر ہانس خوف زدہ نہیں ہوا اور اسے گھور کر رہ گیا۔ پھر وہ میرے چچا کی طرف لپکا، میں اس کی شدت سے کپکپانے لگا۔ شعلہ میرے ایک پاؤں کے چاروں طرف چکرانے لگا، مگر میں اپنا پاؤں اس جگہ سے نہ اٹھا سکا۔

فضا میں گیس کی ناگوار سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنا پاؤں اس جگہ سے کیوں نہیں ہٹا پا رہا تھا؟ کیا وہ عرشے سے چپک گیا تھا؟ میں نے محسوس کیا کہ شعلوں کی اس گیند نے

عرشے پر پڑی ہوئی تمام چیزوں میں مقناطیسی خصوصیت پیدا کر دی ہے۔ ہماری تمام بندوقیں اور اوزار اِدھر اُدھر دوڑتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے پھر رہے تھے۔ میرے جوتے میں لگی ہوئی کیلیں عرشے میں پیوست ایک فولادی پلیٹ سے چپک گئی تھیں۔

اس وقت جب کہ وہ شعلے مجھے جلا کر خاک کر دینے والے تھے میں نے طاقت لگا کر اپنا پاؤں عرشے سے کھینچ لیا۔ اچانک شعلوں کی گیند پھٹ گئی اور چاروں طرف آگ ہی آگ پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شعلے ہمیں ہڑپ کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔

پھر وہ شعلے بجھ گئے اور اچانک تاریکی چھا گئی۔ آخری لمحوں میں میں نے دیکھا کہ چچا جان عرشے پر لیٹے ہوئے ہیں اور ہانس اب بھی بیڑے کو چلا رہا ہے۔

۲۵ر اگست، منگل

میں تھوڑی دیر پہلے ہوش میں آیا تھا۔ ہم اب بھی طوفان میں گھرے ہوئے تھے۔ آسمان پر پہلے کی طرح بجلی کڑک رہی تھی اور پنچ شاخے آسمان سے زمین کی طرف کوند رہے تھے۔ ہم سمندر ہی میں تھے اور بیڑا انتہائی تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔ ہم انگلستان کے نیچے سے، رودبار کے نیچے سے، فرانس کے نیچے سے اور غالباً سارے یورپ کے نیچے سے گزر رہے تھے۔

پھر ایک نئی آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً ایسی آواز تھی جیسے سمندر چٹانوں کو توڑتا ہوا کہیں سے گزر رہا ہو۔

## بچ نکلے

یہاں میری ڈائری ختم ہوتی ہے۔

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس وقت کیا ہوا جب سمندر کی لہروں نے ہمیں چٹانوں کی طرف اُچھال دیا۔ میں اس وقت بیڑے سے سمندر میں گرنے والا تھا کہ ہانس کے مضبوط

اور طاقتور ہاتھوں نے مجھے تھام لیا۔ آئس لینڈ کا وہ بہادر مجھے ساحل تک لے گیا اور جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اپنے چچا کے پہلو میں پڑے پایا۔ پھر وہ چٹانوں کی طرف گیا اور بیڑے پر سے جو کچھ بچا کر لا سکتا تھا لے آیا۔

میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ ایک گھنٹے تک میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔ ہانس نے تھوڑا سا کھانا تیار کیا' مگر میں کمزوری کی وجہ سے اسے ہاتھ تک نہ لگا سکا اور شدید تکلیف کے عالم میں سو گیا۔

دوسری صبح موسم خوش گوار تھا۔ پروفیسر کی چہکتی ہوئی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔

"آہا میرے بچے' تمھیں ٹھیک سے نیند آئی؟"

مجھے یہ خیال آیا کہ شاید میں کنکس اسٹریٹ والے مکان میں ہوں اور جولی سے شادی والے دن ناشتہ کرنے اوپری منزل سے نیچے آ رہا ہوں۔

مگر نہیں' بیڑا شاید جرمنی کے نیچے سے گزر چکا تھا' میرے شہر ہمبرگ کے نیچے سے' اس سڑک کے نیچے سے جہاں جولی رہتی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے تقریباً سو میل کے فاصلے پر تھے' مگر یہ سو میل عمودی تھے اور ہمارے بیچ میں گرینائٹ کی ٹھوس چٹانیں تھیں۔

"تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ تمھیں کیسے نیند آئی؟" چچا جان نے پوچھا۔

"میں اب بھی تھکا ہوا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر آپ بہت ہشاش بشاش ہیں چچا جان۔"

"میں خوش ہوں میرے بچے' بہت خوش' اس لیے کہ بالآخر ہم پہنچ گئے۔"

"اپنا سفر ختم کر کے اپنی منزل پر پہنچ گئے؟"

"نہیں۔ اس سمندر کے اختتام پر پہنچ گئے جو کبھی ختم نہ ہونے والا محسوس ہو رہا تھا۔ اب ہم دوبارہ خشکی پر سفر کر سکتے اور حقیقت میں نیچے جا سکتے ہیں۔"

"چچا کیا میں ایک سوال کر سکتا ہوں؟"

"ہاں البرٹ تم کر سکتے ہو۔"

"ہماری واپسی کیسے ہو گی؟"

"بہت آسانی سے۔ ہم کوئی نیا راستہ تلاش کر لیں گے یا پھر جس راستے سے آئے تھے اس سے واپس چلے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بند نہیں ہو جائے گا۔"

"ایسی صورت میں ہمیں بیڑے کی مرمت کرنا پڑے گی۔"

"یقیناً"

"مگر ہمارے پاس کیا اتنی خوراک ہے کہ ہم یہ سفر کر سکیں؟"

"ہانس بہت ہوشیار ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے کافی خوراک بچالی ہو گی۔ آؤ چلو دیکھتے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ بیڑے کی ہر ایک چیز تباہ ہو چکی ہو گی مگر میں غلط سوچ رہا تھا۔ ہانس ساحل پر ملا' اس کے گرد سب چیزیں نہایت سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میرے چچا نے احسان مندی سے ہاتھ ملائے۔ اس وقت جب کہ ہاتھ پاؤں پھیلائے ساحل پر پڑے ہوئے تھے ہانس اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے سامان بچا رہا تھا۔ ہماری بندوقیں گم ہو چکی تھیں' مگر باقی سب چیزیں بچ گئی تھیں جن میں اوزار اور بارود تک شامل تھے۔

"یہ رہا مونو میٹر۔" چچا نے کہا۔ "سب سے کار آمد اوزار' ہم اس کے ذریعہ سے معلوم کر لیں گے کہ ہم مرکز تک کب پہنچے۔ اس کے بغیر ممکن ہے ہم آگے نکل جائیں۔"

ان کی خوشی میں اندیشے اور وسوسے شامل ہو رہے تھے۔

"مگر قطب نما کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں اس چٹان پر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کرونو میٹر اور تھرمو میٹر بھی ہے۔ ہانس نے بہت شاندار کام کر دکھایا ہے کہ انھیں بچا لیا۔"

"اور خوراک"

"آؤ دیکھتے ہیں۔" پروفیسر نے کہا۔

وہ ڈبے جن میں ہماری خوراک تھی' ایک قطار میں رکھے تھے۔ بسکٹ' نمک لگا گوشت' خشک مچھلی سب ہی کچھ تھا اور یہ سب اتنا تھا کہ ہم چار مہینے تک کھا سکتے تھے۔

"چار مہینے!" چچا خوشی سے چلائے۔ "اتنے عرصے میں تو ہم مرکز تک پہنچ کر واپس آ سکتے ہیں اور جو کچھ اس میں سے بچے گا اس سے میں جوہانائم کے پروفیسروں کو ڈنر کی دعوت دوں گا۔"

چچا کی باتیں مجھے حیران کر رہی تھیں۔

انھوں نے کہا "ہمیں ان چٹانوں کے درمیان سے بارش کا وہ پانی جمع کر لینا چاہیے جو طوفان نے یہاں چھوڑا ہے۔ پھر میں ہانس سے کہوں گا کہ وہ بیڑے کی مرمت کر دے' حالانکہ میرا خیال ہے کہ اس کی دوبارہ ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"کیوں نہیں پڑے گی؟" میں چیخا۔

"بس ایک خیال ہے میرے بچے کہ ہم اس راستے سے واپس نہیں جائیں گے جس سے کہ آئے ہیں۔"

انھیں اپنی بات کا یقین نہیں تھا پھر وہ درست کیسے ہو سکتے تھے!

"آؤ چلو چل کر ناشتہ کریں۔" وہ بولے۔

جب وہ ہانس کو ہدایات دے چکے تو میں ان کے پیچھے چلنے لگا۔ کھانے کے دوران مجھے خیال آیا کہ اتنے مزے دار کھانا میں نے کبھی نہیں کھایا۔ میں نے پوچھا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟

"قطعی طور پر ٹھیک ٹھاک بتانا دشوار ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ پچھلے تین دن کا ریکارڈ میرے پاس نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں حساب لگا سکتا ہوں۔"

"وہ جزیرہ جہاں کہ فوارہ....."

"جزیرہ البرٹ میرے بچے' وہ زیرِ زمین پہلا جزیرہ ہے جسے ہم نے دریافت کیا۔"

"ٹھیک ہے جزیرہ البرٹ تک ہم بحیرہ بروک سے چھے سو پچھتر میل کا سفر کر چکے

تھے اور آئس لینڈ سے ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ اس مقام سے حساب لگانا شروع کرتے ہیں۔ چار دن ہم نے طوفان میں گزارے اور اس دوران ہم نے ہر چوبیس گھنٹوں میں تقریباً دو سو میل کا فاصلہ طے کر لیا ہو گا۔"

اس طرح آٹھ سو میل مزید جوڑ لینا چاہئیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بحیرہ بروک ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ڈیڑھ ہزار میل ہے۔ اس کو یوں سمجھ لو کہ یہ بحر روم کے برابر ہے۔"

"گویا ہم نے اس کی چوڑائی پار کی ہے۔"

"ہاں۔ یہ ممکن ہے۔"

"اس کے علاوہ اگر ہمارا حساب درست ہے تو بحر روم اس وقت ہمارے سروں پر ہے۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔ اس لیے کہ ہم رکیاوک سے بائیس سو پچاس میل کے فاصلے پر ہیں۔"

"ہم نے بہت لمبا راستہ طے کر لیا ہے' میرے بچے' مگر ہم یہ یقین سے اس وقت تک نہیں کہہ سکتے کہ ہم بحر روم کے نیچے ہیں جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ طوفان کے دوران ہماری سمت تبدیل نہیں ہوئی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ سمت تبدیل نہیں ہوئی ہے' اس لیے کہ ہوا نے اپنا رخ تبدیل نہیں کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کنارہ پورٹ جولی کے جنوب مشرق میں ہے۔"

"ہوں۔ ہم قطب نما دیکھ کر اس کا پتا چلا سکتے ہیں۔"

پروفیسر اس چٹان کی طرف چلنے لگے جہاں ہانس نے سب اوزاروں کو قرینے سے جھاڑ پونچھ کر رکھا تھا۔ اس وقت ان کا چہرہ نوجوانوں کی طرح سے چمک رہا تھا۔ اس چٹان کے قریب پہنچ کر انھوں نے قطب نما اٹھایا اور اس کی سوئی کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر انھوں نے اپنی آنکھیں ملیں اور دوبارہ دیکھا۔ اس کے بعد وہ حیرت سے میری طرف مڑے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں قطب نما کی طرف دیکھوں۔ میں نے ان کے ہاتھ سے اسے لے لیا۔ قطب نما کی سوئی کی نوک جنوب کی طرف اشارہ کر رہی تھی! اور وہ سمندر کی طرف اشارہ کرنے کے بجائے زمین کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے قطب نما کو ہلایا جلایا اور ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل صحیح کام کر رہا تھا۔ مگر میں جہاں بھی اسے لے جاتا تھا سوئی غیر متوقع طور پر اس سمت کی طرف اشارہ کرنے لگتی۔ طوفان کے دوران ہوا نے لازماً اپنا رخ تبدیل کیا تھا اور بیڑے کو اسی کنارے پر لا کر ڈال دیا تھا جہاں سے کہ ہم چلے تھے۔

# حیرت ناک دریافت

میں نے کسی شخص کو پہلے اتنا تعجب کرتے اور پھر غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ ان سب خطرات اور حالات سے کیا ہمیں دوبارہ گزرنا ہوگا؟

"ہوا' آگ اور پانی نے مل کر میرا راستہ روکنے کی کوشش کی' مگر وہ نہیں روک سکتیں۔" چچا جان چیخے۔ "وہ دیکھ لیں گی کہ میں کتنا طاقتور اور حوصلہ مند ہوں۔ میں اس سفر کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

میں نے انھیں خاموش کرانے کی کوشش کی۔ "میری بات سنیے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم ناممکنات کو ممکن نہیں بنا سکتے۔ کوئی بھی ہوا کے مخالف ہزار میل کا سفر ان سڑے بسے درخت کے تنوں' چند کمبلوں اور دو چھڑیوں کے مستول کے ذریعہ سے نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اس کی کوشش دوبارہ کریں گے تو دیوانے....."

میں اپنی بات صرف دس منٹ تک جاری رکھ سکا اس لیے کہ جو کچھ میں کہہ رہا تھا

پروفیسر اسے قطعی نہیں سن رہے تھے۔

"بیڑے پر چلو۔" وہ چلا کر کہہ رہے تھے اور یہی ان کا جواب تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں میرا کوئی عذر قبول نہیں کیا۔ ان کا ارادہ گرینائٹ سے زیادہ سخت اور ٹھوس تھا۔

ہانس نے تھوڑی دیر پہلے بیڑے کی مرمت ختم کی تھی' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ پروفیسر کا کیا ارادہ ہے۔ اس نے سفر کا سب سامان عرشے پر رکھ دیا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور ہوا شمال مغرب کی طرف سے چل رہی تھی۔

میں ایسے مالک اور ملازم کے خلاف کیا کر سکتا تھا؟ میں عرشے پر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ چچا نے مجھے روک دیا۔

"ہم کل سے پہلے نہیں چلیں گے۔" وہ بولے "اب ہمیں ساحل کے اس حصے کو گھوم پھر کر دیکھنا ہے جہاں اس وقت ہم موجود ہیں۔"

یوں سمجھیے کہ اگر ہم شمالی ساحل پر واپس آگئے تھے تو پورٹ جولی پر یقیناً نہیں پہنچے تھے۔ وہ قدرے مغرب کی طرف تھا۔ اس لیے اس علاقے کا معائنہ کرنا دانشمندی تھی۔

"آیئے اس کو دریافت کرنا شروع کرتے ہیں۔"

ہانس بیڑے کے قریب ٹھہر گیا جب کہ میں اور چچا وہاں سے چل پڑے۔ اس جگہ چٹانوں اور سمندر کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ہم بڑے بڑے گھونگوں پر پاؤں رکھ کر چلنے لگے جن میں قبل از تاریخ کی مخلوق رہا کرتی ہوگی۔ وہاں ایسے پتھر پڑے تھے جنھیں سمندر نے گول کنکروں میں تبدیل کر دیا تھا۔

"خوب!" میں نے اپنے آپ سے کہا "اس سے کسی حد تک بحیرۂ بروک سمندر کی وضاحت ہوتی ہے۔ زمین میں رخنے اور درزیں ہونے کی وجہ سے ہمارے سمندروں کا پانی وہاں داخل ہوا اور ان چٹانوں تک پہنچ گیا۔ پھر یہ پانی گرمی کی وجہ سے بخارات بن کر اُڑ گیا۔ اسی لیے بادل بنے اور بجلی بھی پیدا ہونے لگی۔

فطرت کے اس اصول اور قاعدے پر میں مطمئن تھا۔ میں نے سوچا فطرت کے اصولوں کو طبیعیات کے اصولوں سے ہی ثابت کیا جاسکتا ہے۔

ہم ایک میل تک چلے ہوں گے کہ زمین کی ہیئت تبدیل ہونے لگی۔ وہ کھردری ہوگئی اور کئی جگہوں سے کھوکھلی دکھائی دی۔ ہم قدم جما جما کر چل رہے تھے کہ اچانک ایک ایسے میدان میں پہنچ گئے جہاں دور تک ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ہڈیوں کی یہ قطاریں افق تک چلی گئی تھیں۔ ہمارے سامنے ایک طرح سے جانوروں کی دنیا کی تاریخ بکھری پڑی تھی۔

ہم آگے بڑھے تو ہڈیاں ہمارے قدموں تلے آکر چرمرانے لگیں' وہ ایسی ہڈیاں تھیں کہ انھیں حاصل کرنے کے لیے عجائب گھروں میں لڑائی ہو سکتی تھی!

میں اتنا حیرت زدہ تھا کہ میرے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ ان قیمتی ہڈیوں کو دیکھ کر چچا جان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چند منٹ بعد انھوں نے ریت پر سے ایک کھوپڑی اٹھالی "البرٹ..... البرٹ" انھوں نے جوش و جذبات سے کانپتی آواز میں کہا۔ "یہ انسانی کھوپڑی ہے۔"

کھوپڑی ملنے پر چچا کے ہیجان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو بتادیا جائے کہ ہم سفر پر روانہ ہونے والے تھے تو یورپ میں کیا ہوا تھا۔

۱۸۶۳ء میں فرانس میں ایبی وائل کے نزدیک ایک انسانی جبڑے کی ہڈی پتھر کی چند کلھاڑیوں کے ساتھ زمین سے چودہ فیٹ نیچے دریافت ہوئی تھیں۔ یہ انسانی ڈھانچے کی اپنی نوعیت کی پہلی دریافت تھی۔ بہت سے سائنس دانوں کا جن میں پروفیسر بروک بھی شامل تھے خیال تھا کہ یہ کواٹرنیری عہد کا انسان ہے۔ جب کہ دوسروں کا خیال تھا کہ وہ اتنا قدیم نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک بحث چل نکلی اور دونوں طرف سے دلیلیں دی جانے لگیں۔

آپ میرے چچا کی خوشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انھیں پہلے ایک انسانی کھوپڑی ملی پھر کواٹرنیری عہد کے انسان کا مکمل ڈھانچہ۔

میں حیرت سے خاموش کھڑا تھا۔ میرے چچا جو عموماً زیادہ باتیں کرتے ہیں' وہ بھی خاموش کھڑے تھے۔ ہم نے وہ ڈھانچہ اٹھایا اور اسے ایک چٹان سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ وہ ہماری طرف اپنی کھوکھلی اور بے نور آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

تب میرے چچا ایک بار پھر پروفیسر بن گئے۔ پروفیسر بروک یہ بھول گئے کہ ہم کہاں ہیں' وہ اس سفر کو بھی بھلا بیٹھے۔ وہ تصور کے عالم میں جوہانائم پہنچ گئے جہاں وہ طالب علموں کو لیکچر دے رہے تھے۔ "طالب علمو! مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں کواٹرنیری عہد کا انسان پیش کر رہا ہوں۔ چند سائنس داں کہہ چکے ہیں کہ وہ ایسے آدمی کے وجود پر یقین رکھتے ہیں' جب کہ کچھ دوسروں کا کہنا ہے کہ وہ نہیں رکھتے۔ ایسی دریافتوں کے بارے میں سائنس کو محتاط رہنا چاہیے۔ کچھ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ کواٹرنیری عہد کے کسی جانور کی ہڈیاں ہیں مگر اس وقت آپ کے سامنے مکمل ڈھانچہ کھڑا ہے جسے آپ دیکھ سکتے اور چھو سکتے ہیں۔"

پروفیسر نے یہاں ٹھہر کر ڈھانچے کو پکڑ کر اٹھا لیا۔

"آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ چھے فیٹ لمبا انسانی ڈھانچہ ہے جو کاکیشس نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ "ایں..... لڑکو! ہنسو نہیں۔"

وہاں کوئی بھی نہیں مسکرا رہا تھا مگر پروفیسر کو لیکچر کے دوران طالب علم مسکراتے دکھائی دیتے تھے۔

"یہ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ یہاں تک کیسے آیا؟" انھوں نے اپنا لیکچر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "غالباً کواٹرنیری عہد میں زمین پر جو رخنے اور درزیں پڑی ہوں گی یہ ان میں سے پھسل کر یہاں تک پہنچ گیا۔ بہر حال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ میری طرح سے ایک سیاح ہے جو یہاں پہنچ گیا ہے' یہ کواٹرنیری عہد کا انسان ہے۔"

پروفیسر نے اپنا لیکچر ختم کیا تو میں نے زور سے تالی بجائی۔ چچا درست کہہ رہے تھے' آگے ہر قدم پر انسانی ڈھانچے ملے جن کے ذریعے سے ہم اپنا نظریہ ثابت کر سکتے تھے۔

پھر ایک خیال سے ہمیں اندیشہ پیدا ہوا اور ہم چونک گئے۔ جب یہ لوگ بحیرہ بروک کے ساحل پر اوپر سے گرے تھے تو مر چکے تھے یا اس مصنوعی آسمان تلے اس دنیا میں پہلے سے رہ رہے تھے؟ ابھی تک ہمیں دو ہی مخلوق ملی تھیں، مچھلیاں یا پھر سمندری عفریت۔ یہ ممکن تھا کہ بنی نوع انسان یہاں زندہ حالت میں موجود ہو۔

ہم اپنے تجسس سے مجبور ہو کر مسلسل آگے بڑھتے رہے اور ہڈیوں کے ڈھیر ہمارے قدموں تلے آکر چرمراتے رہے۔ یہاں اور کون سا عجوبہ مل سکتا تھا؟ سائنس کے لیے ہم یہاں اور کون سا خزانہ دریافت کر سکتے تھے۔

ہم ساحل سے دور ہوتے جا رہے تھے، مگر پروفیسر اس کی پروا کیے بغیر کہ ہم راستہ بھول سکتے ہیں متواتر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ہم خاموشی سے بجلی کی اس روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے جس سے کوئی سایہ نہیں بن رہا تھا۔

ایک میل کے بعد ہم ایک بڑے جنگل کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ کھمبیوں کا وہ جنگل تھا جو ہمیں پورٹ جولی پر ملا تھا بلکہ یہ حقیقت میں ٹرٹیری عہد کا جنگل تھا۔ اس کے لمبے درخت اور پودے بھورے اور دھندلائے ہوئے رنگ کے تھے اس لیے کہ انھیں سورج کی روشنی نہیں مل پا رہی تھی۔ ان پتیوں کا کوئی رنگ نہیں تھا اور ان کے پھولوں میں کوئی خوشبو نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کاغذ کے بنے ہوئے ہوں۔

میرے چچا سیدھے اس جنگل میں گھستے چلے گئے، مگر جھجک رہے تھے، میں ان کے پیچھے تھا۔ جانوروں کے لیے وہاں اتنا سارا چارا تھا اس لیے یہ ممکن تھا کہ وہاں بھی کسی عفریت سے ملاقات ہو جاتی۔

میں اچانک ٹھہر گیا اور میں نے اپنے چچا کی کمر تھام لی۔ میرا خیال ہے کہ مجھے کوئی بڑا جانور نظر آیا تھا، کسی جانور کا ڈھانچہ نہیں بلکہ زندہ جانور۔ ہاں، ہاں! میں نے ہاتھی دیکھے تھے جو درختوں سے پتیاں نوچ کر کھا رہے تھے۔ میں نے قبل از تاریخ زمانے کا جو خواب دیکھا

تھا وہ صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ اب ہم لوگ غیر محفوظ تھے۔

میرے چچا نے ایک دو بار ادھر دیکھا۔ پھر میرا بازو تھام کر بولے۔ "آگے بڑھو۔"

"نہیں۔" میں چلایا۔ "ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ ان خوفناک جانوروں کے درمیان خالی ہاتھ جا کر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"کوئی خوف ناک جانور؟" میرے چچا نے کہا۔ "تم غلط کہہ رہے ہو۔ مجھے اپنی جیسی مخلوق۔ ایک انسان نظر آ رہا ہے۔"

میں نے نہ چاہتے ہوئے اس طرف دیکھا۔ وہ صحیح کہہ رہے تھے۔ تقریباً چوتھائی میل کے فاصلے پر ایک چرواہا درخت سے ٹیک لگائے کھڑا اپنے عظیم گلے کی نگہبانی کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے ہمیں جو ڈھانچہ ملا تھا' وہ اس کی طرح سے نہیں تھا۔ وہ دیو قامت شخص بارہ فیٹ لمبا تھا۔ اس کے سرکسی گائے کے سر جتنا بڑا اور بال شیر کی طرح سے لمبے تھے۔ اپنے ہاتھ میں اس نے ایک بڑی سی شاخ تھام رکھی تھی۔

جونہی ہماری اس پر نگاہ پڑی تھی ہم ٹھٹک کر رہ گئے تھے اس اندیشے سے کہ وہ ہمیں دیکھ لے گا تو نقصان پہنچائے گا۔ اس لیے ہمیں وہاں سے بھاگنا چاہیے۔

"آیئے..... آیئے بھاگ چلیں۔" میں نے اپنے چچا سے کہا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میری بات سنی اور اس پر عمل کیا اس طرح سے پندرہ منٹ بعد ہم اپنے دشمن سے کافی دور جا چکے تھے۔

ہم نے جس شخص کو دیکھا تھا' کیا واقعی وہ کوئی انسان تھا؟ آج اس واقعہ کو کئی مہینے گزر چکے ہیں لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ کوئی انسان اس زیر زمین دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیں یقیناً دھوکا ہوا تھا۔ یہ سوچنا دیوانہ پن ہے۔

بہر حال اس وقت بحیرہ بروک پر جو مناظر ہمیں نظر آئے تھے' انھیں دیکھ کر تو ہم گنگ رہ گئے تھے۔

اس دیوزاد انسان کے علاوہ ہمیں وہاں کئی اور چیزیں بھی دکھائی دیں جن سے پورٹ جولی کی یاد تازہ ہو گئی۔ خیال آیا کہ شاید ہم شمالی کنارے پر پہنچ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ مجھے وہ چشمہ اور غار نظر آیا جس میں مجھے دوبارہ زندگی ملی تھی۔ لیکن چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہر ایک چیز بالکل نئی ملی۔

"ہم نے جہاں سے اپنا سفر شروع کیا تھا طوفان نے بالکل ٹھیک وہیں لا کر نہیں پھینکا ہے۔ اگر ہم اس ساحل پر مسلسل آگے بڑھتے رہیں گے تو غالباً ہم پورٹ جولی پہنچ جائیں گے۔" میں نے چچا سے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو ہم اپنے بیڑے کی طرف بھی واپس جا سکتے ہیں۔ تمھیں یقین ہے کہ تم درست کہہ رہے ہو البرٹ؟" انھوں نے پوچھا۔

"یہ کہنا مشکل ہے چچا جان اس لیے کہ یہ ساری چٹانیں ایک جیسی لگتی ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ وہی بندرگاہ ہے جہاں ہانس نے بیڑا تیار کیا تھا۔"

"نہیں البرٹ' اگر یہ وہی جگہ ہوتی تو ہمیں کوئی نہ کوئی نشانی ضرور ملتی۔"

"مجھے مل گئی۔" میں چیخا اور تیزی سے اس چیز کی طرف بڑھا جو زمین پر پڑی تھی۔ میں نے اسے اٹھا لیا' اور چچا کو دکھایا۔ وہ ایک زنگ آلود چاقو تھا۔

"اچھا اچھا۔" وہ بولے۔ "تو یہ چاقو اس وقت تمھارے پاس تھا جب ہم پہلے یہاں تھے۔"

"نہیں میرا نہیں بلکہ آپ کا....."

"یہ میرا نہیں ہے' مگر ہانس کا ہو سکتا ہے وہی ایسے ہتھیار رکھتا ہے۔ اسی نے گرا دیا ہو گا۔"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا' ہانس کے پاس ایسا چاقو نہیں تھا۔

"تو پھر کیا یہ اسی دیوزاد انسان کا ہے۔" میں نے کہا "مگر نہیں' اس کا پھل تو فولاد کا ہے۔"

"البرٹ خاموش رہو اور دماغ پر زور ڈالو۔" چچا نے سرد آواز میں قطع کلامی کی۔ "یہ چاقو سولھویں صدی عیسوی کا ہتھیار ہے۔ یہ نہ تو میرا ہے اور نہ ہی تمھارا۔ یہ ہانس کا بھی

نہیں ہے اور نہ یہاں رہنے والے کسی انسان کا۔"

آپ کا مطلب ہے کہ.....؟"

"اس کی طرف غور سے دیکھو۔ ہم ایک بڑی دریافت کرنے جا رہے ہیں۔ یہ چاقو اس ریت پر ایک دو دن سے یا ایک سال سے نہیں پڑا ہوا ہے۔ بلکہ اسے یہاں پڑے ہوئے تین سو سال گزر چکے ہیں اور یہ ان چٹانوں پر پڑے پڑے زنگ آلود ہو گیا ہے۔"

"مگر یہ یہاں خود تو نہیں آیا ہو گا" میں چیخا۔ "ہم سے پہلے بھی یہاں کوئی آیا ہو گا۔"

"ہاں' ایک شخص۔"

"اور وہ آدمی۔"

"اس شخص نے اس چاقو سے اپنا نام ان چٹانوں پر کھودا تھا۔ وہ زمین کے مرکز تک جانے والے راستے کی نشاندہی کرنا چاہتا تھا۔ آؤ گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں۔"

ہم جوش و جذبے کے ساتھ ان چٹانوں کا جائزہ لینے لگے۔ ہم ہر ایک رخنے اور دراڑ کو دیکھ رہے تھے۔ بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سمندر آکر چٹانوں سے ٹکراتا تھا۔ دو چٹانوں کے درمیان ہمیں ایک تاریک سرنگ دکھائی دی۔ وہاں ایک چٹان پر دو پُراسرار حروف کھدے ہوئے تھے جو یہاں آنے والے حوصلہ مند سیاح کے نام کا مخفف رہے ہوں گے۔

"اے۔ ایس۔" چچا نے کہا۔ "آرنی سیکسنم۔ پھر وہی آرنی!"

میں ان دو حروف کو جو تین سو سال پہلے کھودے گئے تھے' دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا تھا اس پر ہمیں حیرت ہونی چاہیے تھی۔ اس چٹان پر آرنی کے نام کا مخفف ہی نہیں تھا بلکہ اسے جس چاقو سے کھودا گیا تھا' وہ میرے ہاتھ میں تھا۔ اب مجھے اس شخص اور اس کے عظیم سفر پر یقین آ گیا۔

پروفیسر بروک' آرنی کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔

"شاندار آدمی!" انھوں نے کہا۔ "تم نے اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق ہر وہ قدم

اٹھایا جو تم اٹھا سکتے تھے تاکہ دوسرے لوگوں کے لیے یہ زیر زمین میں راستہ کھل سکے۔ تین صدیاں گزرنے کے بعد اب بھی وہ تمھارے قدموں کی رہنمائی میں سفر کر سکتے ہیں۔ تم نے دوسروں کی آنکھوں کے لیے یہ ممکن کر دکھایا ہے کہ وہ ان عجوبات کو دیکھ سکیں۔ تمھارا نام جو اس چٹان پر کھدا ہوا ہے ان لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے جو زمین کے مرکز تک جانا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے میں بھی گرینائٹ کے اس آخری صفحے پر اپنا نام کھودوں گا۔ سمندر میں یہ راستہ تم نے دیکھا اور دریافت کیا ہے اس لیے میں اسے کیپ آرنی کہوں گا۔"

جب میں نے چچا جان کو اس طرح سے خود کلامی میں دیکھا تو میری دلچسپی بھی بڑھ گئی۔ میں اس سفر کے خطرات کو بھول گیا' وہ جو کہ پیش آئے تھے اور وہ جو کہ پیش آنے والے تھے۔ آرنی جو کچھ کر چکا تھا میں بھی وہی کروں گا۔

"آگے چلیے..... آگے چلیے۔" میں نے کہا۔

اور جوش میں آگے بڑھنے لگا۔ مگر حیرت انگیز طور پر پروفیسر نے مجھے روک دیا۔

"چلو پہلے ہانس کے پاس چلتے ہیں۔" انھوں نے کہا "اور بیڑے کو یہاں لے کر آتے ہیں۔"

میں نے ان سے اتفاق کیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔

"چچا جان۔" میں نے کہا۔ "اب تک قسمت نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔"

"البرٹ تمھارا یہ خیال ہے۔"

"ہاں۔ میں اس طرح سے سوچ رہا ہوں۔ حد یہ ہے کہ وہ طوفان ہمارے لیے خوش قسمتی کا باعث تھا۔ موسم اگر خوش گوار ہوتا تو ہمیں بحیرہ بروک کے جنوبی کنارے پر لے جاتا' جہاں جا کر ہم گم ہو جاتے۔ طوفان ہمیں یہاں واپس لے آیا اس طرح سے ہمیں آرنی کا نام مل گیا۔"

"ہاں البرٹ' میں بھی کہوں گا کہ قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے اس کے سوا اور کوئی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اور اب ہم شمال کی طرف دوبارہ جا رہے ہیں' اور افریقہ

کے صحراؤں کے نیچے رینگنے یا اور کسی راستے پر جانے کے بجائے ہم یورپ کے شمالی ملکوں کی طرف جا رہے ہیں۔"

"ہاں البرٹ تم صحیح کہتے ہو۔ ہر ایک چیز درست انداز میں پیش آ رہی ہے۔ اب ہم اس سمندر کو چھوڑ رہے ہیں اور اس کے بعد نیچے اور نیچے جائیں گے۔ تم یقین کرو کہ ہم مرکز سے چار ہزار میل کے فاصلے پر ہیں؟"

"بس ہمیں اتنا ہی سفر کرنا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آیئے چلتے ہیں۔"

جب ہم ہانس کے پاس پہنچے تو اسی موضوع پر دیوانے پن سے گفتگو کر رہے تھے۔ ہر چیز تیار تھی اس لیے ہم کیپ آرنی کی طرف سفر کرنے لگے۔ سست رفتاری سے تین گھنٹے بعد، شام چھے بجے ہم وہاں پہنچ گئے۔ میں بیڑے سے چھلانگ مار کر ساحل پر پہنچ گیا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں بیڑے کو جلا دینا چاہیے تاکہ اگر ہمیں پسپائی اختیار کرنا پڑے تو ہم واپس پلٹ کر اس میں نہ بیٹھ جائیں، مگر چچا جان نے انکار کر دیا۔

"بہر حال ہمیں بغیر کسی تاخیر کے یہ سفر شروع کر دینا چاہیے۔"

"ہاں میرے بچے، مگر اس سے پہلے سرنگ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ ہمیں سیڑھی کی ضرورت تو نہیں پڑے گی۔"

پروفیسر نے اپنی لالٹین اٹھالی اور میں اس سرنگ کی طرف بڑھ گیا جو بیس گز کے فاصلے پر تھی۔ وہ پانچ فیٹ چوڑی تھی اور اس کی سطح زمین کے برابر تھی، اس لیے ہم کسی دشواری کے بغیر اس میں داخل ہو سکتے تھے۔ تقریباً چھے قدم چلنے کے بعد راستے میں ایک بڑی چٹان آ گئی اور راستہ بند ہو گیا۔

"اوہ نہیں!" میں غصے میں چلّایا۔

ہم نے دائیں بائیں، اوپر نیچے دیکھا کہ شاید کہیں سے نکلنے کا راستہ مل جائے مگر ایسی کوئی جگہ نہیں تھی۔

میں مایوسی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ جب کہ چچا جان آگے پیچھے ٹہلنے لگے۔

"مگر آرنی یہاں سے گزرا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں یہ سوچنے کی بات ہے۔" چچا بولے۔ "کیا اس چٹان نے اس کا راستہ بھی روکا تھا؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے کہا۔ "جب وہ اپنے سفر سے واپس ہو کر زمین کی سطح تک پہنچ گیا ہو گا تب یہ چٹان راستے پر گر پڑی ہو گی۔ جس طوفان میں ہم گھر گئے تھے ممکن ہے ایسے ہی کسی طوفان کی وجہ سے یہ چٹان گر پڑی ہو۔ بہر حال اگر ہم نے اسے کسی نہ کسی طریقے سے یہاں سے نہیں ہٹایا تو ہم زمین کے مرکز تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔"

مجھے حیرت تھی کہ میں نے یہ جملے کیسے ادا کیے شاید مجھ میں پروفیسر کی روح حلول کر گئی تھی۔ میں ماضی کو بھول چکا تھا اور مستقبل سے مجھے نفرت تھی۔ زمین کی اوپری سطح پر میری دلچسپی کے لیے کچھ نہیں تھا، ہمبرگ، کنکس اسٹریٹ اور نہ جولی۔

"ٹھیک ہے تو اسے کلھاڑیوں سے توڑ ڈالتے ہیں۔"

"کلھاڑیوں سے ٹوٹنا مشکل ہے۔"

"تو پھر؟"

"اسے بارود سے اڑایا جا سکتا ہے۔"

"یہ کام ہانس کرے گا۔" چچا نے کہا۔

ہانس بیڑے کی طرف چلا گیا تاکہ بارود اور کلھاڑی وغیرہ وہاں سے لا سکے۔

"ہم یہاں سے ضرور گزریں گے۔" میں نے جوش اور ولولے سے کہا۔

"ہم یہاں سے ضرور گزریں گے۔" میرے چچا نے دہرایا۔

آدھی رات کے قریب ہماری تیاری ختم ہو گئی۔ ہانس نے اس چٹان میں اتنا بڑا سوراخ بنا لیا تھا کہ اس میں بارود بھرا جا سکے۔ پھر اس بارود میں ایک فلیتہ لگا دیا۔ جب ہم فلیتے میں آگ لگانے والے تھے تو اچانک چچا جان نے اعلان کیا:

"اسے ہم کل اڑائیں گے۔"
گویا ہمیں مزید چھے گھنٹے انتظار کرنا تھا۔

# غار کی تہ میں

دوسرے دن، جمعرات ۲۷ اگست کو ہمارا سفر نیا رخ اختیار کر رہا تھا۔ اب بھی جب مجھے وہ لمحات یاد آتے ہیں تو میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔

چھے بجے ہم بیدار ہو گئے۔ اس وقت گرینائٹ کے ٹکڑے اڑانا تھا۔ میں نے اجازت چاہی کہ میں فلیتے کو شعلہ دکھاؤں۔ ہم نے حساب لگا لیا تھا کہ جب فلیتے کو شعلہ دکھایا جائے گا تو وہ دھیرے دھیرے سلگتا ہوا بارود تک دس منٹ میں پہنچے گا۔ اس اثناء میں، میں اسے شعلہ دکھا کر واپس بیڑے پر اپنے ساتھیوں میں جا سکتا تھا۔

ہم سب نے جلدی سے ناشتہ کیا۔ پھر چچا جان اور ہانس عرشے پر واپس چلے گئے جب کہ میں کنارے پر ایک لالٹین کے ساتھ کھڑا رہا۔

"جاؤ میرے بچے۔" چچا نے کہا "اور جب اس فلیتے کو شعلہ دکھا دینا تو ہمارے پاس واپس آ جانا۔"

"فکر نہ کیجیے۔" میں نے کہا۔ "میں وہاں کھیلنے نہیں بیٹھ جاؤں گا۔"

میں سرنگ کے داخلی حصے کے قریب گیا اور میں نے لالٹین کا شیشہ اٹھا کر ایک تیلی جلائی۔ چچا جان کرونو میٹر لیے ہوئے تھے۔

"تیار ہو؟" انھوں نے چیخ کر پوچھا۔

"ہاں۔ میں تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر شعلہ دکھا دو۔"

میں نے تیلی سے فلیتے کو شعلہ دکھایا اور بھاگ کر واپس کنارے تک پہنچ گیا۔

"عرشے پر آجاؤ۔ چچا بولے۔ "اور یہاں سے چلو۔"

ہانس بیڑے کو سمندر میں ساٹھ فیٹ تک لے گیا۔

یہ بہت ہیجان خیز لمحات تھے۔ پروفیسر کرونو میٹر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔" انھوں نے کہا۔ "چار..... تین..... دو..... ایک..... اب تمھارا گرینائٹ کا پہاڑ اڑنے والا ہے۔ اپنے سر نیچے کر لو۔"

پھر کیا ہوا؟ میرا خیال ہے کہ مجھے دھماکے کی آواز نہیں سنائی دی البتہ میں نے چٹانوں کو کسی پردے کی طرح کھلتے دیکھا۔ کنارے پر ایک گڑھا سا بن گیا۔ سمندر میں ایک بڑی لہر اٹھی اور اس کے ساتھ ہی ہمارا بیڑا اٹھتا چلا گیا۔

ہم تینوں منہ کے بل عرشے پر گرے۔ سمندر کی موجوں میں اتنی گھن گرج تھی کہ ہم آپس میں باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ وہ چٹان جسے ہم نے بارود سے اڑایا تھا اس کے ٹوٹنے کے بعد ایک غار پیدا ہو گیا تھا۔ سمندر کا پانی تیزی سے اس میں داخل ہو رہا تھا اور ہمارا بیڑا بھی اسی طرف جا رہا تھا۔ ہر طرف تاریکی تھی۔

میری تمام امیدیں ختم ہو گئیں۔

ایک گھنٹہ گزر گیا..... غالباً دو گھنٹے گزرے۔ مجھے وقت کے گزرنے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے کہ سمندر میں نہ جا پڑیں۔ بیڑا کبھی کبھی سُرنگ کی دائیں بائیں دیوار سے ٹکرا جاتا تو ہم اچھل جاتے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سُرنگ یقیناً کھل چکی ہے۔ آرنی اس راستے پر گیا تھا اور ہمیں وہی راستہ اختیار کرنا تھا مگر ہم اتنے احمق تھے کہ اپنے ساتھ پورے سمندر کو لیے جا رہے تھے۔

اس وقت ہم عمودی حالت میں نیچے جا رہے تھے اور ہماری رفتار بے حد تیز تھی۔

دھماکے کے وقت ہمارا بیٹری سے چلنے والا لیمپ ٹوٹ گیا تھا، مگر ہانس نے جلدی سے

لالٹین جلالی تھی۔ اس کا شعلہ ٹیڑھا تر چھا تھا' مگر اس ہولناک تاریکی میں وہ روشنی غنیمت تھی۔ سُرنگ آگے جا کر کافی چوڑی ہو گئی تھی اور اس کی دونوں دیواریں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہم اس وقت تقریباً اسّی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہے ہیں۔

میرے چچا اور میں نے مایوسی سے چاروں طرف دیکھا' بیڑے کا مستول ہوا سے ٹیڑھا ہو کر ٹوٹ چکا تھا۔ ہوا تیز تھی اس لیے ہم نے اپنی پیٹھ گھمالی۔ چند گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ میں نے اوزاروں کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ قطب نما اور کرونو میٹر ہی باقی بچے ہیں۔ بیڑے میں لگے ہوئے اوزار جن رسیّوں سے بندھے تھے وہ ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ سب سے ہولناک بات یہ تھی کہ خوراک کے ڈبے بھی سمندر میں گر گئے تھے۔ نمکین گوشت کا ایک ٹکڑا اور چند بسکٹ ہی ہمارے پاس بچے تھے۔

میں نے یہ ہولناک بات چچا جان کو نہیں بتائی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ان کا دماغ ٹھنڈا رہے اور وہ اپنے مزاج قابو پائے رہیں۔

تھوڑی دیر بعد لالٹین بجھ گئی۔ ہمارے پاس ایک ٹارچ تھی' مگر ہم اسے روشن نہیں کر سکے۔ میں نے کسی بچے کی طرح آنکھیں بند کر لیں تاکہ چاروں طرف کی تاریکی سے مجھے ڈر نہ لگے۔

ہم نیچے ہی نیچے گرتے جا رہے تھے۔ میرے چچا اور ہانس نے میرے ہاتھ تھام رکھے تھے اور بیڑا ہم تینوں کو لیے چلا جا رہا تھا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ رات تقریباً دس بجے خاموشی چھا گئی۔ پانی کی لہروں کی گھن گرج اچانک ختم ہو گئی۔

"ہم اوپر جا رہے ہیں۔" چچا چیخے۔ "اوپر!"

میں نے اپنے بازو پھیلائے تو وہ سُرنگ کی دیواروں سے ٹکرا گئے اور چٹانوں سے رگڑ کھا کر مجھے چوٹ لگی۔ ہم نہایت تیزی سے اوپر جا رہے تھے۔

"ٹارچ..... ٹارچ..... روشن کرو۔" پروفیسر چیخے۔

ہانس نے کافی دشواری کے بعد ٹارچ جلادی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم جس راستے سے گزر رہے ہیں اس کی چوڑائی بیس فیٹ کے قریب ہوگی۔ پانی گڑھے کی تہ تک پہنچ چکا ہے اور اب رفتہ رفتہ بلند ہو رہا ہے اس لیے بیڑا بھی اوپر اٹھ رہا ہے۔"

"یہ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے؟"

"معلوم نہیں، مگر ہمیں ہر بات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہم بارہ فٹ فی سیکنڈ یا آٹھ میل فی گھنٹہ کے حساب سے اوپر اٹھ رہے ہیں۔ اس حساب سے ابھی ہمیں کافی فاصلہ طے کرنا ہے۔"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "اگر راستے میں کسی چیز سے ٹکرا کر ہمارے ٹکڑے نہ ہو گئے۔"

"البرٹ!" چچا جان نے نہایت سکون سے کہا۔ "ہم کسی لمحے ختم ہو سکتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی کسی بھی لمحے بچ سکتے ہیں، ہمیں دونوں باتوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"مگر اب ہم کیا کریں گے؟"

"کھانا کھائیں گے تاکہ توانا رہ سکیں۔"

"کھانا؟" میں نے دُہرایا۔ اب وقت تھا کہ میں حقیقت بتا دوں۔

"کیا؟" میرے چچا چیخے۔ "سب خوراک سمندر میں ڈوب گئی؟"

"ہاں۔ سوائے گوشت کے ایک ٹکڑے کے۔ کیا اب بھی آپ کا خیال ہے کہ ہم بچ جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

انھوں نے جواب نہیں دیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ہم سب کو بھوک لگ رہی تھی، لیکن کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ خوراک کے اس آخری ٹکڑے کو ہاتھ لگائے۔

ہم اب بھی تیزی سے اوپر جا رہے تھے، اس کے ساتھ ہی درجۂ حرارت میں بھی

اضافہ ہو رہا تھا جو اس وقت یقیناً چالیس درجہ سنٹی گریڈ تھا۔ ہم اب تک جن تجربات سے دوچار ہوئے تھے اس کے برخلاف میں ابھی تک یقین رکھتا تھا کہ ہم بالآخر ایسے مقام پر پہنچنے والے تھے جہاں حدّت سے چٹانیں پگھل جاتی ہیں۔

"اگر ہم نہ ڈوبے اور نہ ہی کسی چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہوئے اور بھوک سے بھی نہیں مرے تو ہم جل کر مر جائیں گے۔" میں نے پروفیسر سے کہا۔

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا جس کے دوران درجۂ حرارت کچھ اور بڑھ گیا۔ بالآخر میرے چچا نے کہا۔ "اگر ہم موت سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کا علاج کریں' اس لیے بھوک سے ہماری نقاہت بڑھ رہی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری!"

"یقیناً نہیں۔" پروفیسر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "جس انسان میں قوّت ارادی ہوتی ہے وہ ناامید نہیں ہوتا ہے۔"

انھوں نے کیسا شاندار جواب دیا تھا! وہ واقعی غیر معمولی انسان تھے۔

"آپ کی کیا تجویز ہے' ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"ہمارے پاس جتنی خوراک ہے وہ ہمیں استعمال کر لینا چاہیے' ہو سکتا ہے یہ ہماری آخری خوراک ہو' مگر اسے کھا کر ہماری توانائی لوٹ آئے گی اور ہم دوبارہ انسان بن سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے ہم کھانا کھاتے ہیں۔" میں نے ان سے اتفاق کیا۔

میرے چچا نے گوشت اور بسکٹ کے تین برابر حصے کیے اور ہر ایک کو اس کا حصہ دے دیا۔ چچا اور میں نے اپنا حصہ کسی بھوکے اور لالچی شخص کی طرح کھایا جب کہ ہانس نے اپنی غذا کا لطف لیا اور اسے دھیمے دھیمے چبا کر کھایا۔ اسے جن کی آدھی بوتل مل گئی تھی' اس نے تینوں میں اسے تقسیم کر دیا۔

مجھ میں امید کی ایک ہلکی سی روشنی پیدا ہوئی' مگر ہماری آخری خوراک ختم ہو گئی۔

صبح کے پانچ بج چکے تھے اور ہم تینوں خاموش تھے۔

میں حیران تھا کہ ہانس کیا سوچ رہا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں کنکس اسٹریٹ کے مکان کے متعلق سوچ رہا تھا کہ مجھے جولی اور مارتھا کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔

چچا اپنا کام نہیں بھولے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ٹارچ دبی ہوئی تھی اور وہ نہایت ہوشیاری سے ان چٹانوں کا جائزہ لے رہے تھے جن کے قریب سے ہم گزر رہے تھے۔ وہ ان کی ساخت سے اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔

"گرینائٹ۔" انھوں نے کہا۔ "ہم اب بھی پرانے زمانے میں ہیں۔ مگر ہم اوپر ہی اوپر جا رہے ہیں۔ اب اس کے بعد کیا ہونے والا ہے؟" انھوں نے جیسے خود سے سوال کیا۔

پھر انھوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر سرنگ کی چٹانوں کو چھوا آہستہ سے ان کا نام لیا اور کہنے لگے۔ "ہم جلد ہی....."

انھوں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے وضاحت نہیں چاہی کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

درجۂ حرارت بڑھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہمیں جیکٹ اور پھر ویسٹ کوٹ اتارنا پڑیں گے۔

"کیا ہم کسی بھٹی میں جا رہے ہیں؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"ناممکن .....ناممکن؟" چچا نے جواب دیا۔

"یہ دیوار رفتہ رفتہ گرم ہوتی جا رہی ہے۔" میں نے دائیں طرف کی دیوار کو چھوتے ہوئے کہا۔ میرا ہاتھ اتفاق سے پانی پر گر گیا تھا میں نے فوراً اس سے ہٹا لیا۔

"پانی اُبل رہا ہے۔" میں چیخا۔

میرے چچا نے غصے سے سر ہلایا۔

مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ مجھے ایک ایسا خیال آیا کہ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے اب تک جو کچھ دیکھا تھا اس سے مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میں صحیح ہوں۔ میں نے ٹارچ

سے دیواروں پر روشنی پھینکی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دیواروں نے حرکت کرنا شروع کی ہو۔اس کے علاوہ گرمی' اُبلتا ہوا پانی..... میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے قطب نما دیکھنا چاہیے۔

مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قطب نما اپنے حواس کھو بیٹھا ہو۔

## آتش فشاں کا پھٹنا

جی ہاں' قطب نما دیوانہ ہو گیا تھا۔اس کی سوئی تیزی سے چاروں طرف گھوم رہی تھی اور کوئی ایک خاص سمت نہیں بتا رہی تھی اور صرف یہی نہیں تھا' زوردار دھماکے بھی ہو رہے تھے' مسلسل اور کان پھاڑ دینے والے' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے طوفان آگیا ہو۔

میرا خیال درست تھا۔سُرنگ پھٹنے والی تھی اور اس کا لاوا ہمیں جلا کر راکھ کر دینے والا تھا۔

"چچا جان' چچا جان۔" میں چیخا۔ "ہم لوگ ختم ہونے والے ہیں۔"

"اب کیا ہو گا؟" انھوں نے سکون سے کہا۔

"کیا ہو گا؟ ان لرزتی دیواروں کی طرف دیکھیے یہ گرمی اور یہ ابلتا ہوا پانی' یہ دیوانہ قطب نما۔کیا یہ زلزلے کی علامتیں نہیں ہیں؟"

چچا نے انکار میں اپنے سر کو ہلایا۔

"زلزلہ؟" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں!"

"میرے بچے' میرا خیال ہے کہ تمھاری طبیعت صحیح نہیں ہے۔"

"کیا! آپ ان علامتوں کو نہیں پہچان رہے؟"

"زلزلے کی؟ نہیں مجھے اس سے بھی کوئی اچھی توقّع ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"البرٹ یہ پھٹنے والا ہے۔"

"پھٹنے والا ہے؟ کیا آپ کا مطلب ہے کہ ہم ایک متحرک آتش فشاں میں ہیں؟"

"ہاں یہی میرا مطلب ہے۔" پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔ "اور میں خوش ہوں۔"

خوش ہیں! کیا میرے چچا بھی دیوانے ہو چکے تھے؟

"کیا؟" میں نے کہا۔ "یہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے اور ہم اس کے بیچ میں ہیں؟" ہم لاوے اور اُبلتے پانی کے راستے میں ہیں؟ جب یہ پھٹے گا تو ہم گرم چٹانوں اور شعلوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے باہر فضا میں نکلیں گے اور آپ اس پر خوش ہیں؟"

"ہاں۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ سطح پر واپس جانے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔"

وہ درست کہہ رہے تھے' یقیناً بالکل درست۔ اور اب جب کہ اس آتش فشاں کے پھٹنے کا امکان تھا وہ بہت بہادر لگ رہے تھے۔

ہم مسلسل اوپر جا رہے تھے۔ رات ہو چکی تھی اور ہم اوپر جا رہے تھے' اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے آنے والی آوازوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ ہم یقیناً کسی آتش فشاں میں تھے' مگر اس وقت ہم سینی فلز جیسے مردہ کے بجائے کسی زندہ متحرک آتش فشاں میں تھے۔ ہمارے بیڑے کے نیچے ابلتا ہوا پانی تھا اور اس کے نیچے لاوا اور چٹانیں تھیں جو آتش فشاں کے پھٹنے پر دہانے سے ہر سمت میں نکلنے والی تھیں۔ ہم مرنے والے تھے۔ اس کے باوجود مجھے تجسس تھا کہ ہم دنیا کے کس حصہ سے باہر آئیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ شمال میں کوئی جگہ ہو گی۔ قطب نما جب تک بیکار نہیں ہوا تھا' مسلسل یہ ظاہر کر رہا تھا کہ ہم شمال کی طرف جا رہے ہیں۔ کیپ آرنی سے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے شمال میں آ چکے تھے۔ کیا ہم اس وقت دوبارہ آئس لینڈ کے نیچے تھے؟ کیا ہم اس کے آٹھ آتش فشانوں میں سے کسی ایک سے باہر آ جائیں گے؟

صبح کے وقت ہم انتہائی تیزی سے اوپر جا رہے تھے۔ دونوں طرف کی گہری گہری سُرنگوں سے مجھے بھاپ اور شعلے نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔

"دیکھیں..... چچا جان دیکھیں۔" میں نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم اس میں پھنس گئے تو؟"

"ہم پھنس نہیں سکتے۔ اس لیے کہ پہاڑ کا دہانہ کشادہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"اور وہ جو پانی اوپر اٹھ رہا ہے؟"

"اب پانی نہیں ہے البرٹ۔ یہ لاوا ہے' پتلا پتلا لاوا جو ہمیں اوپر لے جا رہا ہے۔"

میں نے غور کیا تو ان کی بات درست لگی۔ وہ پانی نہیں ابلتا ہوا لاوا تھا جو ہمیں آتش فشاں کے دہانے کی طرف لے جا رہا تھا۔ اب درجہ حرارت یقیناً ستر درجہ سنٹی گریڈ تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب ایک نئی بات ہوئی۔ بیڑا اوپر چڑھنا بند ہو گیا اور ایک جگہ ساکت ہو گیا۔ لاوا بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہا تھا۔

"کیا یہ پھٹنا بند ہو گیا؟" میں نے چلّا کر پوچھا۔

"آہ میرے بچے۔" میرے چچا بولے۔ "تمھیں اندیشہ ہے کہ اس کا ابلنا بند ہو گیا ہے' مگر فکر مند نہ ہو ہم جلد ہی اوپر کی طرف دوبارہ حرکت کرنا شروع کر دیں گے۔"

پروفیسر نے گفتگو کے دوران اپنے کرونو میٹر کی طرف دیکھا۔ ایک بار انھوں نے پھر خود کو صحیح ثابت کر دیا تھا۔ بیڑا تیزی سے اوپر اٹھا اور پھر دو منٹ بعد ٹھہر گیا۔

"ٹھیک ہے۔" میرے چچا نے کہا۔ "دس منٹ بعد یہ پھر اوپر جانا شروع ہو گا۔ یہ آتش فشاں ٹھہر ٹھہر کر اُبل رہا ہے۔ اس کے ہر وقفے پر ہم اپنا سانس درست کر سکیں گے۔"

میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عمل کتنی بار پیش آئے گا۔ بہر حال چند منٹ بعد بیڑا اتنی طاقت کے ساتھ اوپر جائے گا کہ دہکتی ہوئی ہوا میرا سانس روک دے گی۔ پھر دس منٹ کے لیے یہ عمل رُک جائے گا اور بے انتہا گرمی سے ہمارا دم گھٹ جائے گا۔

میں نے سوچا اگر ہم آتش فشاں سے نکل کر اچانک برف پر جا پڑیں تو یہ کتنا خوش گوار ہو گا۔ میں نے تصور میں خود کو قطب شمالی کی برف کے قالین پر لڑھکتے پایا۔ میں اب تک کئی مرتبہ پہلو کی دیواروں سے ٹکرا چکا تھا۔ اگر ہانس ہاتھ سے سہارا دے کر مجھے نہ بچا لیتا تو میں شدید زخمی ہو جاتا۔

آیندہ چند گھنٹوں میں مجھے صرف مسلسل دھماکے' حرکت کرتی ہوئی چٹانیں یا تیزی سے گھومتا ہوا بیڑا یاد رہا۔ وہ لاوے کے لہروں پر چکرا رہا تھا اور اس کے چاروں طرف شعلے ناچ رہے تھے۔ کوئی طوفان اس زیر زمین شعلوں کو ہوا دے رہا تھا۔

آخری بار میں نے ہانس کا چہرہ شعلوں میں گھرا دیکھا۔ اس کے بعد پھر آخری ہولناک دھماکا ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری حالت اس شخص کی سی ہے جس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے توپ کے دہانے کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہو' جب کہ توپ چلنے والی ہو!

جب میں نے اپنی آنکھیں دوبارہ کھولیں تو میں نے خود کو پہاڑ کی ڈھلان پر پڑے پایا۔ ہانس کے طاقتور ہاتھوں نے مضبوطی سے مجھے تھام رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے میرے چچا کو سہارا دے رکھا تھا۔ مجھے کوئی گہری چوٹ نہیں آئی تھی البتہ میرے سارے بدن پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔

"ہم کہاں ہیں؟" میرے چچا نے پوچھا جو زمین کی سطح پر اچانک پہنچنے پر حیران رہ گئے تھے۔

"آئس لینڈ میں۔" میں نے کہا۔

"کیا؟" آئس لینڈ میں۔ نہیں" چچا چلائے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سفر کے دوران پیش آنے والے حیرت ناک واقعات میں یہ ایک اور واقعہ تھا۔ مجھے توقع تھی کہ ہم آتش فشاں سے نکل کر کسی پہاڑ کی برفانی چوٹی پر کھڑے ہوں گے' مگر چچا ہانس اور میں ایک پہاڑ کے آدھے راستے پر پڑے تھے اور سورج کی گرم شعاعیں ہمارے جسموں کو جھلسا رہی تھیں۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ کم از کم مجھے آئس لینڈ قبول تھا' اس کے سوا میں کچھ نہیں چاہتا تھا۔ سب سے پہلے پروفیسر بولے:

"یقیناً یہ آئس لینڈ جیسا نہیں لگ رہا ہے۔ یہ شمالی علاقوں کا کوئی آتش فشاں نہیں ہے جس کی چوٹی پر برف جمی ہوتی ہے۔"

"یہ اس جیسا....."

"دیکھو البرٹ' دیکھو!" وہ بولے۔

ہمارے سروں کے اوپر' کوئی پانچ سو فیٹ کی بلندی پر ایک آتش فشاں ہر پندرہ منٹ بعد لاوا اُگل رہا تھا اور ہم سے نیچے تقریباً آٹھ سو فیٹ تک لاوا پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں زیتون کے درخت اور انگور کی بیلیں تھیں' جن پر انگور تھے۔

مجھے ماننا پڑا کہ یہ برفانی علاقہ نہیں ہے۔ میں نے چاروں طرف نگاہ ڈال کر جائزہ لیا تو ایسا محسوس ہوا کہ ہم کبھی جادو نگری میں کھڑے ہیں جو کسی سمندر کے کنارے آباد ہے۔ شوق کی طرف ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی جہاں چند مکانات تھے' اور کچھ عجیب قسم کے بحری جہاز سمندر میں کھڑے تھے۔ کافی فاصلے پر چند جزیرے پھر چند اور پہاڑ تھے۔ شمال کی طرف پانی کی ایک لمبی چوڑی چادر سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔

وہ منظر خوب صورت تھا اور مجھے کچھ زیادہ ہی خوبصورت لگ رہا تھا اس لیے کہ وہ غیر متوقع طور پر سامنے آگیا تھا۔

"ہم کہاں؟ ہم کہاں ہیں؟" میں بار بار پوچھ رہا تھا۔

ہانس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"ہم جہاں کہیں بھی ہیں۔" میرے چچا نے کہا۔ "یہ جگہ بڑی حد تک گرم ہے اور اس آتش فشاں سے مسلسل لاوا بہہ رہا ہے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ ہم اس کے دہانے سے سلامتی سے نکل آئے۔ آؤ نیچے چلیں' کیونکہ بھوک اور پیاس سے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔

میں اس حسین نظارے کی وجہ سے گھنٹوں کھڑا رہ سکتا تھا مگر مجھے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جانا تھا۔ میں نے چند قدم بڑھائے تو معلوم ہوا کہ اس پہاڑ کی ڈھلانیں عمودی ہیں۔" "ہم ایشیا میں ہیں۔" میں چلایا۔ "لازماً ہندستان کے ساحلی علاقے یا ملایا میں۔"

"اور قطب نما کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟" چچا جان نے بات کاٹی۔

"ہاں یقیناً قطب نما۔" میں نے تذبذب سے کہا۔ "قطب نما کے مطابق ہم ہمیشہ سے شمال کی طرف سفر کر رہے تھے۔"

"تو کیا وہ غلط بتا رہا تھا؟"

"غلط؟ نہیں وہ غلط کیسے بتا سکتا ہے؟"

"تو پھر یہ قطب شمالی ہے۔"

"قطب؟ نہیں مگر....."

یہ معاملہ کچھ پُراسرار ہو گیا تھا اور میں ٹھیک طرح سے اس پر سوچ نہیں پا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔

دو گھنٹے تک چلنے کے بعد ہم خوش قسمتی سے ایک پیاری سی جگہ پر پہنچ گئے' جہاں پھلوں کے بہت سے درخت تھے۔ ارغوانی رنگ کے انگوروں کے گچھے کھا کر تازہ پانی پینے کے بعد جو لطف آیا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ درختوں کے درمیان سے ایک چھوٹا سا لڑکا نکل آیا جس کے بدن پر چیتھڑے تھے۔ تین برہنہ لوگوں کو جن کا شیو بڑھا ہوا تھا اور جو نصف برہنہ تھے' دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گیا اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ ہانس نے اسے دوڑ کر پکڑ لیا۔ لڑکے نے چیخنا چلانا اور ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے' مگر ہانس نے اس کی پروا نہیں کی۔

"اس پہاڑ کا نام کیا ہے؟" میرے چچا نے ملائمت سے جرمنی میں پوچھا۔

بچے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"خوب! چچا بولے۔" اس کا مطلب ہے کہ ہم جرمنی میں نہیں ہیں۔"

پھر انھوں نے یہی سوال انگریزی میں کیا۔

بچے نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا یہ لڑکا گونگا ہے؟" "پروفیسر چیخے۔ اپنی زبان دانی پر انھیں فخر تھا۔ لہٰذا انھوں نے یہی سوال فرانسیسی میں کیا۔

بچے کی زبان پر وہی خاموشی چھائی رہی۔

"اٹالین میں کوشش کرتے ہیں۔" چچا نے کہا اور اٹلی کی زبان میں اپنا سوال دُہرایا۔

"اس پہاڑ کا نام کیا ہے؟"

"اسٹرامبولی۔" چرواہے لڑکے نے کہا اور ہانس کی گرفت چھڑا کر درختوں کی طرف بھاگ گیا۔

اسٹرامبولی! اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بحر روم کے بیچ میں تھے!

"اسٹرامبولی!" چچا بھی چلائے۔

"اوہ کیا' سفر تھا! کتنا حیرت ناک! ہم ایک آتش فشاں میں داخل ہوئے اور تین ہزار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد دوسرے سے نکل آئے۔ ہم نے سینی فلز کے بدلے اسٹرامبولی اور آئس لینڈ کی خاکستری دھند کے بدلے نیلا آسمان لے لیا تھا۔

ہم بندرگاہ کی طرف بڑھنے لگے تو راستے میں' میں نے چچا جان کو بڑبڑاتے سنا۔ "مگر قطب نما! قطب نما! وہ تو شمال کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟"

"اس کا مطلب نکالنے یا اس کی وضاحت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا۔

"کیوں؟ یہ تو انتہائی نامناسب بات ہوگی کہ جوہانیم کا پروفیسر اس کی وضاحت نہ کر سکے۔"

جب وہ یہ بات کہہ رہے تھے تو نصف برہنہ سہی مگر اپنی ناک پر چشمہ درست کرتے ہوئے پھر سے معدنیات کے خوفزدہ پروفیسر بن چکے تھے۔

ایک گھنٹے بعد ہم سان ویکنزو کی بندرگاہ پر پہنچ چکے تھے جہاں ہانس نے اپنے تیرہ ہفتوں

کی اجرت طلب کی۔ میرے چچا نے اسے رقم ادا کی اور پھر ہم دونوں نے اس سے مصافحہ کیا۔

# گھر کو واپسی

اگر ہم اسٹر امبولی کے ماہی گیروں کو سچ سچ بتا دیتے تو وہ خوف زدہ ہو جاتے' اس لیے ہم نے انھیں بتایا کہ ہمارے جہاز کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ وہ ہم سے مہربانی سے پیش آئے' انھوں نے ہمیں کھانا اور کپڑے دیے۔ پھر اکتیس اگست کو ایک چھوٹی کشتی ہمیں سسلی کے مقام میسینا لے گئی۔

یہاں ہم نے جمعہ چار ستمبر تک آرام کیا۔ پھر ہم ایک فرانسیسی کشتی سے مارسلز گئے۔ اس وقت ہمیں ایک بات الجھن میں ڈال رہی تھی کہ قطب نما نے شمال کی طرف اشارہ کیوں کیا تھا۔ میں اس الجھن میں ہمبرگ تک مبتلا رہا جہاں ہم نو ستمبر کی شام کو پہنچے تھے۔

میں اسے بیان نہیں کر سکتا کہ ہماری واپسی پر مارتھا اور جولی کتنی خوش ہوئیں۔

"تم ہیرو بن چکے ہو۔" جولی نے کہا۔ "اور اب مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے۔"

وہ مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو موتیوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔

ہمبرگ میں پروفیسر بروک کی واپسی سے خوشی پھیل گئی۔ مارتھا کا شکریہ کہ اس نے ساری دنیا کو اس سے آگاہ کیا کہ ہم دنیا کے مرکز تک گئے تھے۔ لوگوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور جب ہم لوگ واپس آئے تب بھی وہ اس بات کو تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ جب انھوں نے ہانس کو دیکھا اور اس کی زبانی سفر کے حالات سنے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آئی۔

میرے چچا بڑے آدمی بن گئے اور میں ایک بڑے آدمی کا بھتیجا۔

ہمبرگ کے لوگوں نے ان کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا۔ جونا ہم پر ایک پبلک میٹنگ

ہوئی جس میں پروفیسر نے اپنے سفر کی داستان سنائی مگر قطب نما کی پُراسراریت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ انھوں نے آرنی کی وہ تحریر جو چمڑے پر تھی شہر والوں کے حوالے کر دی اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ وہ زمین کے مرکز تک اس کے بتائے ہوئے راستے پر نہ جا سکے۔

انھوں نے دنیا کے سارے سائنس دانوں کے سامنے اپنے اس نظریے کا دفاع کیا کہ جیسے جیسے ہم مرکز تک بڑھتے ہیں تو ٹھنڈک میں اضافہ ہوتا جاتا ہے' مگر جہاں تک میرا یقین ہے تو میں ان سے متفق نہ ہو سکا۔ ہم نے جو کچھ دیکھا تھا مجھے اس پر یقین تھا اور اب بھی یقین ہے کہ زمین کے مرکز کی طرف بڑھنے پر ہمیں شدید گرمی اور حدّت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہانس اب ہم سے رخصت ہو رہا تھا۔ وہ آدمی جس نے کئی مرتبہ ہماری جانیں بچائی تھیں مزید ہمارا مہمان نہیں رہنا چاہتا تھا۔ آئس لینڈ واپس جانا چاہتا تھا' جہاں کا وہ باشندہ تھا۔

"اللہ حافظ" اس نے ایک دن کہا اور رکیاوک واپس چلا گیا۔ ہم اپنے اس شکاری کو کبھی نہیں بھولیں گے اور مجھے یقیناً یہ آرزو رہے گی کہ اس سے دوبارہ پھر کبھی ملاقات ہو۔

میرا یہ سفر نامہ "زمین کہ تہ میں" دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ اس کا دنیا کی ساری زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اس کی مخالفت اور حمایت میں اخبارات میں خوب بحثیں ہوئیں۔ چچا جان کو ان کی زندگی ہی میں بہت شہرت ملی۔

مگر ایک بات ان کو پریشان کرتی رہی وہ یہ کہ ان کی سمجھ میں قطب نما کی پُراسراریت نہیں آئی۔ کسی بھی سائنس داں کے لیے کوئی ایسی بات جس کی وضاحت نہ ہو سکے ہمیشہ الجھن کا باعث رہتی ہے۔

ہماری واپسی کے چھے مہینے بعد ایک دن جب کہ میں پروفیسر کی اسٹڈی معدنیات کے نمونوں کو ترتیب سے رکھ رہا تھا تو میں نے اس مخصوص قطب نما کو ایک گوشے میں پڑا دیکھا۔ میں حیرت سے چیخ پڑا۔

پروفیسر بروک دوڑ کر اندر آئے۔

"کیا بات ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"قطب نما!"

"کیا ہوا ہے؟"

"شمال کی بجائے اس کی سوئی جنوب کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔"

چچا نے اس قطب نما کا دوسرے قطب نما سے موازنہ کیا پھر خوش ہو کر ایک زوردار چیخ ماری جس سے سارا گھر ہل کر رہ گیا۔ اس کا بھید کھل گیا تھا۔

"تو جب ہم کیپ آرنی پہنچے تھے تو اس قطب نما کی سوئی شمال کی بجائے جنوب کی طرف اشارہ کرنے لگی تھی؟"

"جی ہاں۔"

"اس سے ہماری غلطی ظاہر ہوتی ہے، مگر ایسا کیسے ہوا؟"

"بہت آسان بات ہے۔"

"وضاحت کرو میرے بچے۔"

"بحیرۂ بروک میں طوفان کے دوران وہ آگ کا گولہ جو ہمارے بیڑے میں آگیا تھا اس نے ساری فولادی چیزوں کو مقناطیسی بنا دیا تھا۔ وہ قطب نما پر بھی اثر انداز ہوا اور اس نے اس کی سوئیوں کی سمت کو الٹ دیا۔"

"ہاہاہا۔" پروفیسر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "گویا یہ ایک عملی مذاق تھا جو بجلی نے ہمارے ساتھ کھیلا۔"

اس دن کے بعد سے چچا جان بہت خوش رہنے لگے اس لیے کہ ان کی ایک بڑی الجھن دور ہو گئی تھی۔ مجھے بھی ایک خوشی حاصل ہوئی میری شادی جولی سے ہو گئی اور وہ میرے ساتھ کنکس اسٹریٹ کے مکان میں منتقل ہو گئی۔

## جدید ادبی تحریکات و تعبیرات

مصنف : سید حامد حسین

صفحات : 160

قیمت : -/85 روپے

## اردو شاعری کی گیارہ آوازیں

مصنف : عبدالقوی دسنوی

صفحات : 183

قیمت : -/72 روپے

## ابوالکلام آزاد کا ذہنی سفر

مصنف : ظ۔ انصاری

صفحات : 120

قیمت : -/70 روپے

## تاریخ نگاری قدیم و جدید رجحانات

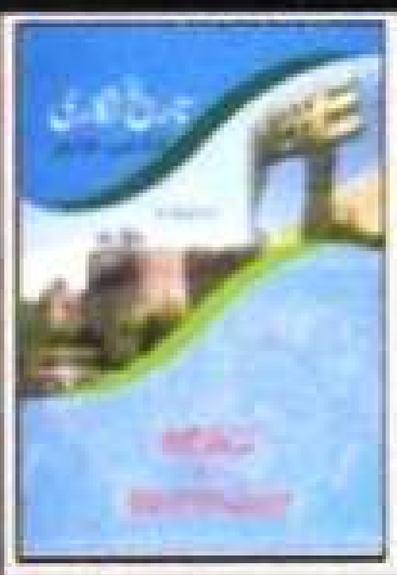

مصنف : سید جمال الدین

صفحات : 156

قیمت : -/83 روپے

## انتخاب محمد قلی قطب شاہ

مصنف : محمد قلی قطب شاہ

صفحات : 240

قیمت : -/93 روپے

## بشام کا پہلا تارا

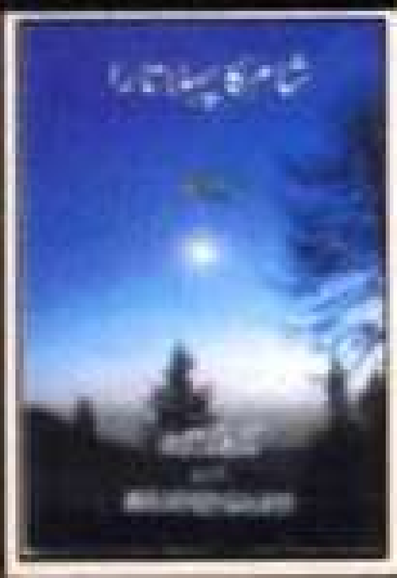

مصنف : زہرا نگاہ

صفحات : 160

قیمت : -/85 روپے

## حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ
(شخصیت اور تصوف)

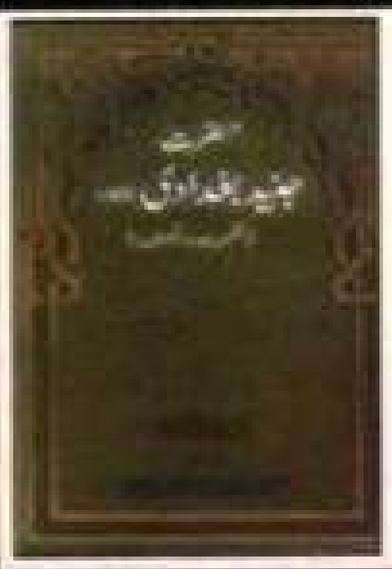

ترتیب و تالیف: ضیاء الحسن فارقی

صفحات : 224

قیمت : -/106 روپے

## ہم کیسے پڑھائیں؟

مصنف : سلامت اللہ

صفحات : 199

قیمت : -/82 روپے

ISBN:978-935160-0169

Price ₹ 70/-